تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں
تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔
سید حسین احسن۔
ایڈمن۔ فیس بک گروپ
03448183736
03145951212

شہر کے شور سے جدا

خوشبیر سنگھ شاد

شہر کے شور سے جدا

خوشبیر سنگھ شادؔ

دہلیز پبلی کیشنز

خوشبیر سنگھ شادؔ

کتاب کا نام	:	شہر کے شور سے جدا
شاعر	:	خوشبیر سنگھ شادؔ
سنہ اشاعت	:	2016
مطبع	:	ایچ. ایس. آفسیٹ، دہلی
قیمت	:	250/
ناشر	:	دہلیز پبلی کیشنز

ISBN : 978-81-928061-6-7

انتساب

اپنے بچوں

پرمیت، گائیتری

اور

اشمیت

کے نام

فہرست

شاؔد: کلامِ خامشی سے تنہائی افروزی تک

فرحت احساس

خوش بیر سے ذاتی اور معنوی ملاقات کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہی کوئی چھے سات سال پہلے دہلی میں فصیح اکمل قادری صاحب کے گھر ان سے روبروئی ہوئی کہ یہ نشست ان کے اعجاز میں تھی جہاں میں بھی مدعو تھا۔ اس سے پہلے خوش بیر کو نہ کبھی سنا تھا نہ دیکھا تھا، کہ ان دنوں مجھ پر شعر و شاعری سے بیزاری کا دورہ، جو اکثر پڑجاتا ہے، پڑا ہوا تھا۔ اس نشست میں بھی میری حاضری مجبوراً اور بہ طور امتثال امر ہی زیادہ تھی۔ مگر محفل میں پہنچتے ہی اس شخص نے جانے کس نگاہ سے، جسے اس کے زیر لب تبسم نے کچھ اور بھی رمز انداز اور کرشمہ کار کر دیا تھا، دیکھا کہ وہی ہوا جو اکثر محبت ہونے سے پہلے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نگاہ مجھے اچک لے گئی تھی اور تب سے آج تک اسی نگاہ سے بندھا چلا آتا ہوں۔ بعد میں خوش بیر نے شعر سنائے جو اچھے لگے مگر اس وقت شعروں سے زیادہ وہ خود اچھے لگے کہ کچھ دیر تک ساتھ رہنے کے بعد ان کی ذات کی طرف سے ایک ایسی بادِ صبا جاری ہوئی جو میرے مشامِ جاں میں سرایت کر گئی۔ اور یہ بادِ صبا آج تک یوں ہی جاری ہے۔

پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک کئی بار سفر و حضر میں خوش بیر کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے اور ایسے ہر موقعے نے ہمارے تعلق کی آزمائش کی ہے جس سے ہم دونوں ہی سرخ رو نکلے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر ذاتی تعلق کی پرکھ کا یہ پیمانہ ٹھہرا رکھا ہے کہ تعلق وہی پائے دار ہے جو گہری چپّیوں کو انگیز کر سکے۔ سو ہماری ان یکجائیوں کے دوران بھی یہی ہوا کہ ہماری زبانیں اور حاضریاں کم اور بے نوائیاں اور گم شدگیاں زیادہ ہم کلام ہوتی رہیں۔ ایسا جب بھی ہوتا ہے باہمی تعلق، ظاہری اور بیرونی تائید و حمایت اور گواہی سے بے نیاز ہو کہ خود گزیں اور خود فروغ ہو جاتا ہے۔

خوش بیر کو قریب سے دیکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ پر ان کی گم شدگی اور دنیا گریزی ظاہر ہو گئی، ورنہ ممکن تھا کہ انہیں مشاعروں میں آتا جاتا دیکھ کر میں ان کے بارے میں کچھ اور

فرض کر لیتا، جو بلا شبہ غلط ہوتا۔ دور حاضر میں ہماری شاعری جس بری طرح چھنال پن کی شکار ہوئی ہے اور بیشتر شاعر (ناشاعر) جس فحش انداز سے 'پیشہ'وری میں مبتلا ہیں، اس کے پیش نظر شاعر کی شناخت اس کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کا چہرہ اپنے اندر کی طرف گھوما ہوا ہو، حاضری میں بھی غائب نظر آئے، موجودگی میں ناموجود رہے اور 'غیروں' کے ساتھ دیر تک رہ جانے پر سب سے بیزار ہو جائے اور بولتے بولتے اچانک گہری چپ کی چادر اوڑھ لے۔ اور پھر یہ کہ وہ شاعری کے سوا اور کچھ بھی کرنے کا اہل نہ ہو۔

خوش بیر ان میں سے بیشتر شرطیں پوری کرتے ہیں اور یہ بات تو بالکل ثابت شدہ ہے کہ شاعری کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ گذر بسر کے لئے انہوں نے یہ کچھ اور کر کے دیکھ لیا اور پھر اسے بند کر کے بیٹھ رہے۔ اب وہ کل وقتی شاعر ہیں۔ یہ ایک عنایت خاص ہے جو سب پر نہیں ہوتی۔ اس کا ثمرہ تخلیے کی وہ حالت ہے جہاں ذات انسانی تصوف کی اصطلاح میں تمام ماسوا سے پاک اور محفوظ ہو جاتی ہے اور قلب کا آئینہ اپنا تمام گرد و غبار چھاڑ کر تجلیات کے نزول کا منتظر اور مشتاق ہو رہتا ہے۔

خوش بیر نے بہت شعر کہے ہیں اور ان کے بہت سے شعر مقبول بھی ہوئے ہیں، عوام میں بھی اور خواص میں بھی۔ ان کے بیشتر اشعار اپنے وجود کی بنیادیں اپنے اندر استوار رکھنے کے ساتھ ہی باہر کی طرف کھلتے ہیں، اور اسی لئے ان میں ترسیل کی بے پناہ سرعت اور صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک اور حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ان کی شاعری ایک گہری اداسی اور محزونی کی کوکھ سی پھوٹتی ہے مگر ان کے لفظوں کا قرینہ اور ان کے استعاروں کا انتخاب اور ان کی باہمی ترتیب و ترکیب ان کے شعروں میں پژمردگی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، شعر کے بنیادی وصف، لفظ اور معنی کے درمیان فاصلہ اور وقفہ رکھنے، سے حتی الامکان ہم کنار ہونے کے باوجود خوش بیر کے بیشتر اشعار پڑھنے یا سننے والے پر اس طرح کھلتے ہیں جیسے کوئی مانوس چہرہ اچانک کسی اور شکل میں سامنے آ گیا ہو اور ہم نوائی کا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ یہ ایک خاص خوبی ہے جو اپنے تمام تر کمال اور جلال و جمال کے ساتھ اٹھارہویں صدی کے دہلوی شعرا میں پائی جاتی ہے جن میں خدائے سخن میر تقی میر سے لے کر میر درد، میر محمدی بیدار، میر سوز، میر اثر اور میر حسن جیسے بہت سے باکمال اہل سخن شامل ہیں۔ خوش بیر اسی راہ پر چل پڑے ہیں، جو ایک بڑی بات ہے، مگر سفر طویل اور پر خار

ہے جس میں قدم قدم گمراہی کا اندیشہ ہے۔ یہ صورت حال اس لحاظ سے اور بھی اہم معلوم ہوتی ہے کہ ان کے بہت سے ہم عصر اور سخنی ہم سفر، جنہوں نے ان کے ساتھ ہی سفر آغاز کیا تھا، اپنی ذات کی تنہائی اور باطن کے تقاضوں سے عیارانہ سمجھوتے کر کے شہرت طلبی اور دیگر مفادات حاصلہ کے حرص میں عوامی شور شرابے اور آشوب تحسین میں غرق ہو چکے ہیں۔

خوش بیر کی زیر نظر کتاب شعر، ان کے شعری سفر کے ایک نہایت اہم مرحلے سے عبارت ہے کہ اس میں جگہ جگہ ظاہر اور باطن، ذات اور زمانہ، محفل اور تنہائی، خاموشی اور گویائی کے درمیان کشاکش ایک گہری دروں بینی اور افسردگی کے پیرائے میں اظہار پاتی ہے۔

مجھے اچھے نہیں لگتے یہ خدوخال میرے
میں اس چہرے میں اک بے چہرگی کا منتظر ہوں

یہ کیا معمول ہے اب خود سے روز وشب الجھنا
بکھر جانا کسی لمحے کسی ساعت سمٹنا

کسی کے بس میں نہیں تھا کہ آگ سے کھیلے
مرے قریب کوئی میرے اک سوا نہ گیا

سکوت شب میں جو یہ شاؔد میں خاموش بیٹھا ہوں
لگا ہوں خامشی کو ہم نوا کرنے کی کوشش میں

اداسی میرے اندر کی کہیں برہم نہ ہوجائے
اگر ہنستا بھی ہوں تو چشم تر سے مشورہ کرکے

اسی وسعت سے جس کے پار جانا غیر ممکن ہے
میں آگے بڑھ گیا حد نظر سے مشور کرکے

شاؔد یہ دنیا اگر غافل سمجھتی ہے تجھے
بے خبر تو بھی گزر جا کوئی ہشیاری نہ کر

یہ اور اسی طرح کے بہت سے شعر، جو اس مجموعے میں جا بجا نظر آتے ہیں، خوش بیر میں جاری اپنے اندر الٹ اور پلٹ جانے کے اس کیمیائی عمل کے غماز ہیں جس کا ثمرہ شدید تر اور سرخ رو ہونے کی صورت میں ایک ذات افروز اور باطن فروغ روحانی عمل میں ظاہر ہوگا۔ اس کتاب کے شعری پیکر خوش بیر سنگھ شاؔد کے سفر ذات کی ان جولان گاہوں اور محشر

ستانوں کی خبر دیتے ہیں جہاں ان کا وجدانِ شعر اور شعوری ادراک ہندوستان کی اس ثروت مند روحانی روایت کے انوار سے جلا حاصل کرتا نظر آتا ہے جس میں ان کے اپنے وجود کے بہت قریب سے گذرنے والے روحانی سرچشمے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ خوش بیر کی شاعری تلاش واظہار ذات کے ساتھ ساتھ غیر ذات کی جستجو اور اس کے جلو میں لاذات کے سرچشموں تک رسائی کی جو صورتیں پیدا کر رہی ہے وہ ہمارے جہانِ شاعری کے لئے ایک خوش آہنگ بشارت کا حکم رکھتی ہیں۔ ہم شاعر کے رقص تخلیق کے شدید تر اور کارسخن کے چاک کے مزید سرگرم ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔

○○

بس اپنے زعم کی تشہیر کر رہی ہے ہوا
میں اتنا بکھرا نہیں جتنا لے اڑی ہے ہوا

یہ احترام مرا کیوں ہے سب پتا ہے مجھے
مجھے نہیں، مری خوشبو کو چاہتی ہے ہوا

میں اس کے ساتھ رہا ہوں کئی بگولوں میں
یوں ہی نہیں مری وحشت کو مانتی ہے ہوا

بتاؤ کون سا کردار ہے پسند تمہیں؟
چراغ عارضی ہوتے ہیں، دائمی ہے ہوا

اٹھا تو لائی مری گرد اپنے شانوں پر
یہ دیکھنا ہے کہاں اب اتارتی ہے ہوا؟

تجھے خبر ہی نہیں ہے تری حفاظت کو
تمام رات اندھیروں میں جاگتی ہے ہوا

جو ٹوٹتا سا تسلسل ہے میری سانسوں کا
کہیں دیارِ بدن میں ٹھہر گئی ہے ہوا

یہ بات شاؔد بہت مشترک ہے دونوں میں
مری ہی طرح یہاں خاک چھانتی ہے ہوا

ہر نفس اک فکر سی بے تاب رکھتی ہے مجھے
نیند کے عالم میں بھی بے خواب رکھتی ہے مجھے

ایک موج مہرباں کا مجھ پہ یہ احسان ہے
خود کو گردش میں، پسِ گرداب رکھتی ہے مجھے

کل اندھیروں میں تھی باہم دیر تک یہ گفتگو
کون سی وہ لَو ہے جو شب تاب رکھتی ہے مجھے؟

بس صدف کھل جائے اور پھر دیکھ لے دنیا تجھے
خوش گمانی میں مری یہ تاب رکھتی ہے مجھے

جذب ہو جاتی ہے خود آنکھوں کے ریگستان میں
ظاہرہ تو یہ ندی سیراب رکھتی ہے مجھے

درد کو اشعار میں تبدیل کر لیتا ہوں میں
یہ ترو تازہ ہوا شاداب رکھتی ہے مجھے

آس ہر نقش میں کچھ رنگ سجانے لگ جائے
خواب سوچیں بھی تو تعبیر ستانے لگ جائے

دستکو کھولتا ہوں میں ابھی دروازۂ دل
درد آیا ہے جو پہلے وہ ٹھکانے لگ جائے

اپنی مرضی سے پلٹتی تو نہیں ہیں آنکھیں
کیا کریں جب کوئی چہرہ ہی بلانے لگ جائے

کیا بُرا ہے تری صورت سی کوئی صورت ہو
دل کہیں اور اگر تیرے بہانے لگ جائے

میں ملاتا نہیں بستی میں کسی سے آنکھیں
پھر کوئی اپنی کہانی نہ سنانے لگ جائے

شادؔ آنکھیں بھی ترو تازہ اٹھیں وقت سحر
کاش یہ نیند کسی خواب کے شانے لگ جائے

سمندر میں بھی تُو کب تک رہے گا؟
تجھے سورج کسی دن لے اڑے گا

میں ضائع ہو رہا ہوں اپنے ہاتھوں
کوئی نقصان میرا کیوں بھرے گا؟

ابھی کچھ دیر میں چہکیں گی شاخیں
ابھی کچھ دیر میں یہ دن ڈھلے گا

بڑی فرصت کی ہے میری کہانی
تو عجلت میں اسے کیسے سنے گا؟

اسے کیوں بے طرح دیکھا ہے تو نے؟
وہ چہرہ آئنے سے کیا کہے گا؟

چلو پانی سے بجھ جائیں گے شعلے
مگر ان سے دھواں بھی تو اٹھے گا؟

جو میں نے توڑ دی اپنی خموشی
تو اتنا شور کیسے سن سکے گا؟

ترا یہ ساتھ کتنا خوش نما ہے
مگر یہ ساتھ بھی کب تک رہے گا

کوئی انکار سا مجھ میں کہیں اٹھنے لگا ہے
مرا اب ان عقیدوں سے یقیں اٹھنے لگا ہے

غبار فکر پہلے بے ضرر ہوتا تھا لیکن
یہ لے کر ساتھ اب دل کی زمیں اٹھنے لگا ہے

یہ کن بجھتے ہوئے سرکش چراغوں کا دھواں ہے ؟
جہاں ممنوع تھا اٹھنا، وہیں اٹھنے لگا ہے

وہ جن خوش فہمیوں میں مبتلا تھے آج تک ہم
وہ پردہ کچھ پلوں میں ہم نشیں اٹھنے لگا ہے

ہے دشتِ آرزو کچھ اور بھی صورت سفر کی
مرا تو ان سرابوں سے یقیں اٹھنے لگا ہے

اتنی وحشت ہے کہ سودائی ہوئے جاتے ہیں
ہم وہ تنہا ہیں کہ تنہائی ہوئے جاتے ہیں

کیوں نہیں ہوتی ہیں منکر مری آنکھیں ان سے
یہ جو منظر مری بینائی ہوئے جاتے ہیں

سر پہ جلتا ہوا سورج ہے زمیں شعلوں سی
ہم تو یہ سوچ کے صحرائی ہوئے جاتے ہیں

دیکھتے رہتے ہیں بدحال طبیعت میں ہمیں
اب تو اپنے بھی تماشائی ہوئے جاتے ہیں

ہم نے دیکھا ہے کہ اس شہرِ طلسمات میں لوگ
ایک آواز کے شیدائی ہوئے جاتے ہیں

اب تو یہ زہر بھی پی لیتے ہیں تیری خاطر
زندگی کیا ترے صحبائی ہوئے جاتے ہیں

شادؔ جو جھوٹ نہ تسلیم کبھی ہم سے ہوئے
آج اِس دور کی سچائی ہوئے جاتے ہیں

دیکھ لو کن گردشوں میں ہم کو لے آئے ہیں خواب
تم نے جو تعبیر کے دھوکے میں دکھلائے ہیں خواب

کچھ تو وہ مانوس چہرے بھی تھے حائل رات بھر
اور کچھ دیرینہ یادوں کے بھی الجھائے ہیں خواب

پھر امیدیں بڑھ گئیں آنکھوں کے ریگستان کی
آج پھر بادل کی صورت ہر طرف چھائے ہیں خواب

یہ تو اک معمول ہے خوابوں نے بہلایا ہمیں
بارہا یوں بھی ہوا ہے ہم نے بہلائے ہیں خواب

خوش گماں ہیں جیسے آنکھوں پر حکومت ہوگئی
اور اپنی اس ادا پر کتنا اترائے ہیں خواب

دیکھنا یہ آبگینے ٹوٹ جائیں نہ کہیں
خواہشوں کے شیشہ گر سے ہم نے بنوائے ہیں خواب

آج پھر کرچوں کی صورت منتشر ہونا ہے شآد
پھر حقیقت کے مقابلِ آج ہم لائے ہیں خواب

وہ جو معمول تھا، اس سے طبیعت کچھ الگ سی ہے
ادھر کچھ دن سے میرے دل کی حالت کچھ الگ سی ہے

کھڑا ہوں میں بھی اس صف میں ، ضرورت مند ہوں میں بھی
مگر اے زندگی میری ضرورت کچھ الگ سی ہے

نہ میں نے اس سے کچھ مانگا، نہ اس نے مجھ سے کچھ چاہا
تعلق کچھ الگ سا ہے، محبت کچھ الگ سی ہے

کوئی ابہام بھی پوشیدہ ہے اظہار میں اس کے
جو واضح تو ہوا لیکن وضاحت کچھ الگ سی ہے

مجھے حیرت زدہ نظروں سے اکثر دیکھتا تھا یہ
مگر اس بار آئینے کی حیرت کچھ الگ سی ہے

مسلط ذہن و دل پر ہے جو یہ بے چہرہ خاموشی
جنوں ہے اور نہ سودا ہے، یہ وحشت کچھ الگ سی ہے

مری مایوس آنکھوں میں بجھے ہیں خواب پہلے بھی
مگر اس بار ان آنکھوں کی رنگت کچھ الگ سی ہے

میں خود کو شادؔ اپنی ذات میں مصروف رکھتا ہوں
میں فرصت میں تو ہوں لیکن یہ فرصت کچھ الگ سی ہے

یہ ایک گہری اداسی ترے خیال کے ساتھ
ملا عروج بھی مجھ کو تو کس زوال کے ساتھ ؟

نہیں جواب تھا دونوں کے پاس جس کا کوئی
وہ بات ختم ہوئی پھر اسی سوال کے ساتھ

تُو اس کے کرب سے واقف کبھی نہ ہو پایا
جو ایک ہجر جیا ہے ترے وصال کے ساتھ

جو زیر کرنے چلا تھا کبھی تجھے دنیا
میں جی رہا ہوں اسی عزم پائمال کے ساتھ

یہ میری باطنی صورت سے مختلف ہیں مگر
نبھا رہا ہوں کسی طور خدوخال کے ساتھ

ترے ستم بھی سہے اور ملال بھی نہ کرے؟
یہ زندگی کوئی تجھ سے سوال بھی نہ کرے؟

یہ دیکھ تجھ کو بلندی نے کیا بنا ڈالا؟
یہ حال کاش کسی کا زوال بھی نہ کرے

پھر اس کا حال ترے دل سا کیوں نہ ہو آخر؟
تُو اپنے گھر کی اگر دیکھ بھال بھی نہ کرے

تُو اس کی راہ پہ خود کو بچھا چکا ہے تو پھر
یہ وقت کیسے تجھے پائمال بھی نہ کرے؟

وہ ایک سحر مری ذات پر مسلط ہے
کمال یہ ہے کہ کوئی کمال بھی نہ کرے

میں ایسے آئنے پہ شادؔ کیوں یقیں کر لوں؟
جو میرا پہلے سا چہرہ بحال بھی نہ کرے

یہ سرابوں کی نمائش ہے لبھانے کے لیے
دشت میں آئے ہو کیوں پیاس بجھانے کے لیے ؟

زندگی درد سے منکر تو نہیں دل پھر بھی
کوئی حد طے بھی تو ہو بوجھ اٹھانے کے لیے

کیا یہ طوفان ضروری تھے سمندر تیرے
ایک خوابیدہ جزیرے کو جگانے کے لیے؟

پھر نہ تصویر سے خاکے میں بدل جاؤں کہیں
دھوپ پھر آئی مرے رنگ اڑانے کے لیے

تم نے اک بات کہی، دل پہ قیامت ٹوٹی
اک شرر کم تو نہیں آگ لگانے کے لیے

میرے باطن سے نہیں اس کا تعلق کوئی
یہ جو ظاہر کا تماشا ہے زمانے کے لیے

شاؔد میں ذکر نہ کرتا ترا تو کیا کرتا؟
ایک کردار تو لازم تھا فسانے کے لیے

جہاں کہا مری آنکھوں نے میں وہاں ٹھہرا
مرے لیے کوئی منظر مگر کہاں ٹھہرا؟

گھرا رہا میں صداؤں سے اپنی منزل تک
تو یہ سفر بھی خموشی کا رائگاں ٹھہرا؟

وہاں کی گرد کے پیروں تلے زمیں ہی نہیں
وہ اک ستارۂ روشن جہاں جہاں ٹھہرا

کسی درخت کا سایہ نہ چھاؤں بادل کی
یہ کیسی دھوپ میں یادوں کا کارواں ٹھہرا؟

ٹھہر تو تُو بھی گیا جا کے اپنی منزل پر
غلط ہے کیا جو سفر کے میں درمیاں ٹھہرا؟

تو اس حسد سے بھلا دیکھتا ہے کیا مجھ کو
میں ایک ابر کا ٹکڑا تو آسماں ٹھہرا

کبھی تو شآدؔ وہ عالم ہوا ہے وحشت کا
کہ بام و در پہ کسی دشت کا گماں ٹھہرا

اس کو تو کرنا تھا اپنی زندگی کا فیصلہ
میں نے کیوں انکار سمجھا خامشی کا فیصلہ

جب اسے نسبت نہیں کچھ میرے احساسات سے
پھر یہ دنیا کیوں کرے میری خوشی کا فیصلہ

اب سرابوں ہی سے پوچھی جائے گی میری سزا
دشت کے ذمے ہے میری تشنگی کا فیصلہ

کیوں کسی منظر سے کچھ کہتی نہیں آنکھیں مری؟
کر چکی ہیں کیا یہ بس نظارگی کا فیصلہ؟

اب وہ تنہائی کے ہاتھوں مر گیا تو کیا کروں؟
مجھ کو تنہا چھوڑنا تو تھا اسی کا فیصلہ

ہر کسی کے ساتھ جب چلنا نہ ممکن ہو سکا
کر لیا پھر شاؔد اپنی ہجری کا فیصلہ

کچھ تو ان آنکھوں کو ذمے دار ہونا چاہیے
سو رہی ہیں جب انہیں بیدار ہونا چاہیے

ان ابھرتے ڈوبتے خوابوں کو یہ تاکید ہو
صبح سے پہلے یہ دریا پار ہونا چاہیے

اک مری آواز ہی کافی نہیں تنہائی میں
اب صداؤ ہر طرف سے وار ہونا چاہیے

تو نے جس انداز میں مجھ کو سنایا ہے اسے
اس کہانی کا تجھے کردار ہونا چاہیے

پھول اپنی خوشبوؤں کو خود ہی کیسے سونپ دیں؟
کچھ ہواؤں کا بھی تو اصرار ہونا چاہیے

ہر روایت بنتی ہے کہنہ روایت توڑ کر
جو نہیں پہلے ہوا، اس بار ہونا چاہیے

عشق نے حیرت زدہ لہجے میں مجھ سے یہ کہا
ایسے عالم میں تجھے بے زار ہونا چاہیے

رابطہ کچھ تو خیالوں کا رہے الفاظ سے
حسن باطن کا بھی کچھ اظہار ہونا چاہیے

شآد پھر اک آبلہ پا آ گیا ہے دشت میں
چاہتا ہے راستہ پرخار ہونا چاہیے

سبب یہی ہے مجھے پائمال کرنے کا
کہ میں نے جرم کیا تھا سوال کرنے کا

اداسیوں نے بڑھائی تھکن خیالوں کی
تھکن نے کام کیا ہے نڈھال کرنے کا

میں اپنی موت پہ رویا کہاں ہوں جی بھر کے؟
ملا ہے وقت ہی کتنا ملال کرنے کا؟

تو اس کے سامنے آیا ہے منتشر ہوکر
یہ آئنہ نہیں تجھ کو بحال کرنے کا

جہاں تھی صرف اجازت قصیدہ خوانی کی
قصوروار ہوں میں عرض حال کرنے کا

یہ کہہ کے ہوگئی رخصت ہراک خوشی مجھ سے
تجھے سلیقہ نہیں دیکھ بھال کرنے کا

کوئی بھی جب نہ شریکِ غم تنہائی ہوا
خود ہی میں اپنے تماشے کا تماشائی ہوا

اپنے خوابوں کو سجاتا رہا میں پلکوں پر
یہی انداز مرا باعثِ رسوائی ہوا

یہ کہاں چھوڑ گئے سارے شناسا مجھ کو؟
یہ کہاں آ کے میں خود اپنی شناسائی ہوا؟

زندگی مَیں بھی تو دل رکھتا ہوں اوروں کی طرح
کیا غلط تھا جو ترا میں بھی تمنائی ہوا؟

تو نہ سمجھے گا کبھی کرب سمندر اس کا
وہ جزیرہ جو ترے وصل سے صحرائی ہوا

اندھیرے وست بستہ جب صدائیں دیں تو ابھرا کر
تو سورج ہے ذرا اپنی انا کا پاس رکھا کر

تری قربت بھی مجھ کو راس ہو ایسا نہیں پھر بھی
اکیلے پن سے ڈرتا ہوں ، مجھے تنہا نہ چھوڑا کر

نہیں اچھا نہیں لگتا مجھے یوں منتشر ہونا
مری لہروں میں اپنی یاد کے پتھر نہ پھینکا کر

تجھے الفاظ کے پیکر ہی میں ہر بات دکھتی ہے
کبھی خاموشیوں کو بھی سنا کر اور سمجھا کر

اگر اک دائمی صورت بنانی ہے تصور کی
جنھیں ہو کاٹنا مشکل وہی پتھر تراشا کر

یہ جو اک زنگ خوردہ آئنہ ہے رو بہ رو تیرے
مسلسل دیکھ اس کو اور اپنا عکس چہرا کر

ترے یہ استعارے شاؔد اب کرتے نہیں دل کو
سخن کے باب میں اب کچھ نئے امکان پیدا کر

جیسا تم کرتے ہو، ایسا نہیں کرتا کوئی
صرف خوابوں پہ بھروسا نہیں کرتا کوئی

خود کو آئینہ بنانا ہی خطا تھی شاید
اب مرے سامنے چہرا نہیں کرتا کوئی

مجھ کو ٹھہرا ہوا دیکھا تو کہا لمحوں نے
اب کسی کے لیے ٹھہرا نہیں کرتا کوئی

ایسا کم زور کیا میرے ارادوں نے مجھے
اب تو خود سے بھی میں وعدہ نہیں کرتا کوئی

تو سمندر سے الجھ بیٹھا ہے کس کی شہہ پر؟
ایسی جرأت تو جزیرہ نہیں کرتا کوئی

ایسے کم ظرف نہیں ہوتے محبت والے
یوں محبت کو تماشا نہیں کرتا کوئی

جن کا کردار ہو آنکھوں کی کہانی سے الگ
ایسے اشکوں پہ بھروسا نہیں کرتا کوئی

غم گساری بھی سلیقے سے ہوا کرتی ہے
شادؔ یوں زخموں کو گہرا نہیں کرتا کوئی

جب سنا تیار ہوں غرقاب ہونے کے لیے
ہوڑ سی لہروں میں ہے گرداب ہونے کے لیے

صبح کیا آواز دے گی کیا جگائے گی مجھے؟
نیند بھی تو چاہیئے بے خواب ہونے کے لیے

ان گزرتے بادلوں کو کوئی کر دے یہ خبر
منتظر ہے اک زمیں سیراب ہونے کے لیے

چاند کے مدمقابل جگنوؤں کی بھیڑ تھی
اک اندھیری رات میں شب تاب ہونے کے لیے

ہر کوئی پیدل گزر جاتا ہے سینے سے مرے
یہ سزا ملنی ہی تھی پایاب ہونے کے لیے

شاؔد آنکھیں اب سمجھنے لگ گئی ہیں دل کا حال
اشک بھی مجبور ہیں خوناب ہونے کے لیے

غیب کے پردوں سے آنکھوں پر عیاں ہونے تلک
فکر نے سو پیرہن بدلے بیاں ہونے تلک

خود شناسی کا سفر کچھ اس طرح سے طے ہوا
سب پہ ظاہر تھا میں اپنا رازداں ہونے تلک

زخم ہوں میں، تم کہاں سمجھوگے میری کیفیت؟
کن مراحل سے میں گزرا ہوں نشاں ہونے تلک

ان سے جانے کتنی تصویریں مکمل ہوگئیں
اس نہیں نے رنگ جو بدلے ہیں ہاں ہونے تلک

اے مرے ہم زاد ذرّو تم سے وعدہ ہے مرا
وقت بس مشکل ہے میرے آسماں ہونے تلک

پھر تو سارے لفظ اس کے نام سے منسوب تھے
بے زباں تھا وہ تو میرے بے زباں ہونے تلک

شآد جو سمٹا ہوا دکھتا ہوں اپنی ذات میں
عارضی صورت ہے میری بے کراں ہونے تلک

منحصر جس خواب پر تھے پارہ پارہ ہوگیا
نفع کی امید میں کتنا خسارہ ہوگیا

آئنے کا ٹوٹنا اک حادثے سے کم نہ تھا
ایک ہی چہرہ تھا گھر میں بے سہارا ہوگیا

ایک دن نکلا تھا یوں ہی خود مَیں خود کو ڈھونڈنے
اور مجھ پر جانے کیا کیا آشکارا ہوگیا

وہ مرا ہم زاد ذرہ دل کے کتنا تھا قریب
فاصلے تو تب ہوے جب اک ستارہ ہو گیا

آپ کو تعبیر بھی اپنی ہی شرطوں پر ملی
اور ہم جیسوں کا خوابوں پر گزارا ہوگیا

شاؔد کیوں آتے نہیں پیاسے پرندے اس طرف؟
کیا مرا پانی سمندر سے بھی کھارا ہوگیا؟

دغا دیتا رہوں باطن کو ظاہر سے نبھاؤں میں
بتا اے زندگی اس بوجھ کو کب تک اٹھاؤں میں؟

مری دریا دلی اترے ہوئے دریا کی صورت ہے
یہ حسرت ہی رہی دل میں کسی کے کام آؤں میں

اسی سرشار لمحے میں بہت یاد آیا ہوں خود کو
وہ جس میں ڈوب کر چاہا تھا خود کو بھول جاؤں میں

سمندر کے کسی ساحل پہ مل جا ایک موتی سا
بچا کر دنیا بھر کی نظروں سے تجھ کو اٹھاؤں میں

یہ کیسی کشمکش ٹھہری ہمارے درمیاں دنیا؟
نہ مجھ کو راس آئے تو نہ تجھ کو راس آؤں میں

کسی دن لطف لوں میں بھی ترے حیران ہونے کا
کسی دن بن بتائے ہی تری محفل میں آؤں میں

بس اک ضد ہی تو حائل ہے ہمارے درمیاں ورنہ
اگر پہلے منائے وہ تو شاید مان جاؤں میں

•

یہ غم جو ٹوٹ کے ملتا ہے والہانہ اِسے
ہے کوئی عشق مرے دل سے غائبانہ اِسے

میں خود کو یکجا کروں جب تو گم نہ ہو جاؤں
یہ میرے گرد جو بکھرا ہے مت اٹھانا اِسے

ترے بیان میں چمکا نہیں ہے درد ابھی
جو ہو سکے تو بنا اور شاعرانہ اِسے

یہ آگ جس نے بنا رکھا ہے تجھے ایندھن
ترا وجود اِسی سے ہے مت بجھانا اِسے

مری شکست کا باعث نہیں ہے یہ دنیا
میں کر رہا تھا یونہی بے سبب نشانہ اِسے

یہ رنگ شادؔ جو ابھرا ہے تیری آنکھوں میں
فقط گمان ہے یہ خواب مت بنانا اِسے

کسی کے لمس کی جادوگری کا منتظر ہوں
میں پتھر ہو کے بھی اک زندگی کا منتظر ہوں

یہ دنیا چل رہی ہے اور میں ٹھہرا ہوا ہوں
یہ لگتا ہے کہ جیسے میں کسی کا منتظر ہوں

مجھے اچھے نہیں لگتے یہ خدوخال اپنے
میں اب چہرے میں اک بے چہرگی کا منتظر ہوں

کوئی ایسی خبر جو زندگی میں رنگ بھر دے
وہ جو حیران کر دے اس گھڑی کا منتظر ہوں

میں اب تک سب صداؤں کے ستم سہتا رہا ہوں
اب اپنی ذات میں اک خامشی کا منتظر ہوں

جو دریا مجھ میں شامل ہیں انھیں کیسے بتاؤں؟
میں رستے میں کسی ٹھہری ندی کا منتظر ہوں

چلوں گا میں بھی پھر دنیا ترے شانہ بہ شانہ
ابھی خودداریوں کی خودکشی کا منتظر ہوں

کئی خوش رنگ لمحے تھک گئے مجھ کو بلا کر
نہ جانے میں ابھی تک کس خوشی کا منتظر ہوں

جو اک عہد گذشتہ ہو چکا ہے شاؔد میرا
میں فردا کے تصور میں اسی کا منتظر ہوں

یہ کیا معمول ہے اب خود سے روز و شب الجھنا
بکھر جانا کسی ساعت کسی لمحے سمٹنا

مرے دل میں بگولے کیوں اٹھاتی ہے ہمیشہ
ہوا تو دشت میں جاکر کوئی دن رقص کرنا

مرے برگ و ثمر تو ہوگئے عادی یہاں کے
جڑیں بھی سیکھ لیں میری اگر مٹی پکڑنا

اگر بے خواب آنکھیں وقت سے پہلے نہ بجھتیں
تو شاید دیکھ لیتیں شب سے تاروں کا بچھڑنا

دھندلکوں میں فراموشی کے اب جو جا چکا ہے
وہ چہرہ یاد بھی آئے تو اُس سے کیا مکرنا؟

سرابوں کے تعاقب میں مری یہ تشنہ کامی
یہ میٹھی جھیل میں پیاسے پرندوں کا اترنا

بہت دلچسپ لگتا ہے مری تنہائیوں کو
سکوتِ شب کا دل کی دھڑکنوں سے بات کرنا

نئے انداز کی ہے شادؔ یہ صحرانوردی
در و دیوار کی وسعت میں وحشت کا بھٹکنا

جدھر سے گزرا صدا آئی وہ دیوانہ گیا
کہاں کہاں مری وحشت ترا فسانہ گیا؟

ہوا نے کہہ دیا پھر صاف صاف لفظوں میں
شجر گرے نہ گرے تیرا آشیانہ گیا

کسی کے بس میں کہاں تھا کہ آگ سے کھیلے؟
مرے قریب کوئی اک مرے سوا نہ گیا

میں ایک پھول کی وسعت میں رہ کے جی لیتا
مگر ہوا نے پکارا تو پھر رہا نہ گیا

تھا میری گرد بہت شور میرے ہونے کا
میں جب تلک تری خاموشیوں میں آ نہ گیا

وہیں پہ بھول گیا اپنی ظاہری صورت
کسی کے در پہ جو اک بار غائبانہ گیا

وہیں کی خاک کا میں رزق ہوگیا آخر
جہاں پہ لے کے مجھے میرا آب و دانہ گیا

ہوائے شب کے سخن تیرگی سمجھتی ہے
یہ وہ زباں ہے جسے خامشی سمجھتی ہے

یہ سازشیں بھی تو ہو سکتی ہیں اندھیروں کی
تری نگاہ جسے روشنی سمجھتی ہے

وہیں پہ چھوڑ دیا ہے ہوا نے لا کے مجھے
جہاں کی خاک مجھے اجنبی سمجھتی ہے

گر اپنی ضد پہ نہ اڑ جائے بے ادب ہو کر
جنوں کی بات کہاں آگہی سمجھتی ہے؟

بس اک فریب ہیں یہ دشتِ آرزو کے سراب
مگر یہ بات کہاں تشنگی سمجھتی ہے؟

ترے عذاب ہی لفظوں میں ڈھالا کرتا ہوں
تو میری جان جسے شاعری سمجھتی ہے

کسی صورت اک ایسا معجزہ کرنے کی کوشش میں
میں ہوں کرچوں کو پھر سے آئنہ کرنے کی کوشش میں

ذرا سی بات پر شاخوں سے برہم ہو گئے پتے
ہوا تو کب سے تھی ان کو جدا کرنے کی کوشش میں

ٹھہر جاؤں نہ میں اک جھیل کی صورت پہاڑوں پر
لگا ہوں پتھروں میں راستہ کرنے کی کوشش میں

کسی صورت میں ان خوابوں کی زد سے بچ گیا ورنہ
یہ دنیا تو تھی مجھ کو مبتلا کرنے کی کوشش میں

مرے اندر کئی پیچیدہ رستے ہیں سوالوں کے
میں جن میں گم ہوں خود سے رابطہ کرنے کی کوشش میں

نہ جانے کیسی گہری نیند میں سوئی ہے تاریکی
ستارے بجھ گئے اِس کو جلا کرنے کی کوشش میں

سکوتِ شب میں جو یہ شآدؔ میں خاموش بیٹھا ہوں
لگا ہوں خامشی کو ہم نوا کرنے کی کوشش میں

بجھا کے مجھ میں مجھے بے کراں بناتا ہے
وہ اک عمل جو شرر کو دھنواں بناتا ہے

نہ جانے کتنی اذیت سے خود گزرتا ہے
یہ زخم تب کہیں جا کر نشاں بناتا ہے

میں وہ شجر بھی کہاں جو الجھ کے سورج سے
مسافروں کے لیے سائباں بناتا ہے

عجب نصیب صدف کا کہ اس کے سینے میں
گہر نہ ہونا اسے رائگاں بناتا ہے

میں خود تو رنگ ہی بھرنے کا کام کرتا ہوں
یہ نقش تو کوئی دردِ نہاں بناتا ہے

نہ سوچ شآد شکستہ پروں کے بارے میں
یہی خیال سفر کو گراں بناتا ہے

یہ خوش لباسی مرا ظاہری تماشا ہے
فصلِ جسم کے اس پار اور دنیا ہے

تو خد و خال سے پڑھتا ہے نفسیات مری
مرا وجود نہیں ہے ، یہ میرا چہرا ہے

اِسی نشیب پہ سورج کا انتظار کرو
یہیں سے شام ڈھلے روز وہ گزرتا ہے

وہ جس کو دیکھ رہے ہو فلک میں اڑتے ہوئے
مری ہی شاخ کے اک آشیاں میں رہتا ہے

سنا تو ہے تجھے سیراب کر چکی بارش
مرے تو سامنے یہ خواہشوں کا صحرا ہے

کسی دکان پہ قیمت پتہ بھی کر ان کی
تو روز و شب جو یہ ریشم سے خواب بنتا ہے

وہ لمحے جن لمحوں میں ہم تنہا ہوتے ہیں
ماضی، حال اور فردا تینوں یکجا ہوتے ہیں

دھوپ ہمیں اک پیکر کے ذمے کر جاتی ہے
شام کے ڈھل جانے تک ہم اک سایہ ہوتے ہیں

ہم نے اپنا ہر رستہ پوچھا ان خوابوں سے
جن کو دنیا کہتی تھی یہ دھوکا ہوتے ہیں

تنہائی کا یادوں سے یہ کیسا رشتہ ہے
کتنے بھولے بسرے پل اک چہرہ ہوتے ہیں

کبھی ہماری وسعت سے ڈرتا ہے صحرا بھی
کبھی سمندر میں ہم ایک جزیرہ ہوتے ہیں

ابھی جو یہ بے شکل سے کچھ خاکے ہیں کاغذ پر
رنگ انہیں مل جائیں تو دیکھو پھر کیا ہوتے ہیں

ہم تو شاؔد ہیں ذات کی تنہائی کا دروازہ
جب کوئی دستک دیتا ہے تب وا ہوتے ہیں

نہ آئے وسعت دنیا مری نظر میں کیوں؟
میں قید ہو کے رہوں صرف بام و در میں کیوں؟

تری تلاش اگر بے خبر ہے منزل سے
تو پھر یہ زحمتِ سفر بھی رہے سفر میں کیوں؟

یہ احتجاج مناسب نہیں ترے حق میں
تو ناخدا سے الجھا ہے یوں بھنور میں کیوں؟

تو اس بلند فضا میں بھی مضطرب کیوں ہے؟
ہے ترا دھیان ابھی تک اُسی شجر میں کیوں

جو درد شاؔد میں سمجھا تھا صرف میرا ہے
دکھائی دینے لگا تیری چشمِ تر میں کیوں؟

تھکن سے، خوف سے، عزم سفر سے مشورہ کرکے
میں اب اڑتا ہوں اپنے بال و پر سے مشورہ کرکے

بس اتنا پوچھ لو اب اور کتنا چل سکوگے تم
مسافت طے کرو رختِ سفر سے مشورہ کرکے

اُسی وسعت سے جس کے پار جانا غیر ممکن تھا
میں آگے بڑھ گیا حدّ نظر سے مشورہ کرکے

مسائل زندگی کے خود بہ خود آسان ہو جائیں
کبھی دیکھو کسی آشفتہ سر سے مشورہ کرکے

عجب ضدّی ہے میرا گھر کہ اب کہتا ہے میں اس کی
کروں آرائشیں دیوار و در سے مشورہ کرکے

جواں بچوں کی اپنی زندگی ہے ان سے کیا شکوہ
جدا ہوتے ہیں کیا پتّے شجر سے مشورہ کرکے؟

اداسی میرے اندر کی کہیں برہم نہ ہو جائے
اگر ہنستا بھی ہوں تو چشم تر سے مشورہ کرکے

مجھے نا معتبر ٹھہرا رہی ہے شآد اگر دنیا
یہ آئی ہے کسی نامعتبر سے مشورہ کرکے

اتنے بکھراؤ میں آساں نہیں یکجا دکھنا
درد صدیوں کا سمیٹے ہوئے لمحہ دکھنا

اب اسے اچھی علامت تو نہیں کہہ سکتے
خواب آنکھوں میں کوئی روز بکھرتا دکھنا

نقص آنکھوں کا کہیں اس کو کہ آئینے کا؟
ایک چہرے کا کوئی اور ہی چہرہ دکھنا

زندگی تیری طلب اور بڑھا دیتا ہے
روز کچھ زہر رگ و پے میں اترتا دکھنا

دیکھ سورج تجھے مشکوک نہ کر دے یہ کہیں
شام ڈھلنے سے کہیں پہلے اندھیرا دکھنا

ایک امید نے یوں شاد کیا ہے جیسے
ایک کشتی کو سمندر میں جزیرہ دکھنا

صرف خوابوں کا یہ دھوکا نہیں تعبیر بھی دے
نقش کو رنگ عطا کر کوئی تصویر بھی دے

مرے نسخے میں جو لکھی ہیں دعائیں تو نے
بے اثر ہیں یہ ابھی تک انھیں تاثیر بھی دے

یہ جو تو روز پلٹ آتا ہے اپنی جانب
وہ صدا بن جو خلاؤں کا جگر چیر بھی دے

خوب ہاتھوں پہ لکیروں کو سجایا تو نے
اب انہیں شان کے شایاں کوئی تقدیر بھی دے

یہ جو بے سمت بھٹکتے ہیں خیالوں کے نقوش
ان کو لفظوں سے ملا اور کوئی تحریر بھی دے

شاؔد ہوں اس لیے در کھلتا نہیں مجھ پہ کوئی
اس اداسی میں صدا اب کوئی دل گیر بھی دے

نہیں انکار کچھ دنیا تری رعنائیوں سے
مگر میں منسلک ہوں ذات کی تنہائیوں سے

یہاں کشمیر سے اب قد بنائے جارہے ہیں
کہ پیکر ڈھل رہے ہیں اب انھیں پرچھائیوں سے

کئی بیدار منظر تھک گئے ہم کو بلاکر
مگر نکلے کہاں ہم نیند کی گہرائیوں سے؟

جو مجھ پر آج اس درجہ مسلط ہے یہ دنیا
بڑھے ہیں حوصلے اس کے مری پسپائیوں سے

ہیں جتنے بھی حوالے عشق کی اس داستاں میں
ہوئے ہیں معتبر سب عشق میں رسوائیوں سے

کہ جن سے ہر تعلق ترک کر بیٹھی ہیں آنکھیں
وہ چہرے شادؔ کیوں الجھے مری بینائیوں سے؟

انکار کو واضح کرنے میں چہرے کی وضاحت کافی تھی
الفاظ کو یوں ہی زحمت دی بدلی ہوئی رنگت کافی تھی

کیا جانے کن بے حس لمحوں کے ہاتھوں ہم کنگال ہوے
پہلے تو ہمارے پاس بھی یہ احساس کی دولت کافی تھی

ہم بھی بھٹکے، تم بھی بھٹکے، منزل نہ ملی ہم دونوں کو
دونوں سنجیدہ ہو جاتے تو ایک محبت کافی تھی

کچھ دیر ہواؤں کے دم پر یہ خاک بگولہ کر لیتے
تو ہم جیسے صحراوں کو اتنی ہی وحشت کافی تھی

کچھ اور زیادہ تلخی سے دنیا نے نوازا کیوں ہم کو
ہم جیسے مفلس لوگوں کو بس اتنی نعمت کافی تھی

تصور میں تھا اپنا اب پرایا ہو چکا ہے
مرے شعروں میں ڈھلتے ہی وہ سب کا ہو چکا ہے

اجالوں کی رفاقت پر بہت اترا رہی تھیں
خبر کر دو ان آنکھوں کو اندھیرا ہو چکا ہے

اسے دیکھا تھا شاید نیند کے غلبے میں پہلے
وہ مبہم عکس اب شفاف چہرہ ہو چکا ہے

سبھی کردار اس کی داستاں کے جاچکے ہیں
بہت رونا ہے اس کو اب اکیلا ہو چکا ہے

بچا کچھ بھی نہیں ہے اب نئی لاگت کی خاطر
مرا تو عشق میں اتنا خسارہ ہو چکا ہے

مری آنکھوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے
یہاں پہلے بھی ایسا اک تماشا ہو چکا ہے

یہی پرچھائیاں ہیں شاؔد اب پہچان اِن کی
کڑکتی دھوپ میں ہر جسم سایہ ہو چکا ہے

دشت طلب کی بات بھی مانی نہیں گئی
تم سے ذرا سی خاک بھی چھانی نہیں گئی؟

پہلی نظر میں اچھے لگے تھے بہت سے لوگ
پھر اس کے آگے اپنی کہانی نہیں گئی

شعلوں کے پاس لے گئی خاشاک کو ہوا
لیکن جہاں تھی آگ بجھانی نہیں گئی

ہو تو گئے بحال تعلق سبھی مگر
دل میں جو اک خلش تھی پرانی، نہیں گئی

وہ رات اک کنیز کے سپنوں کی رات تھی
اس رات خواب گاہ میں رانی نہیں گئی

دل اب کہیں یقین کی صورت ٹھہر بھی جا
اب تک تری یہ نقلِ مکانی نہیں گئی

لفظوں کو پھر گواہ بنایا گیا ہے شآد
اشکوں کی اک دلیل بھی مانی نہیں گئی

سچ کہوں جس بات کی اتنی پذیرائی ہوئی
تھی مرے اشعار کے پیکر میں دہرائی ہوئی

ہائے یہ کس موڑ پر لے آئی مجھ کو زندگی
ہائے یہ کس موڑ پر خود سے شناسائی ہوئی

اب اُسی دنیا سے آخر کام مجھ کو پڑ گیا
ایک مدت تک رہی جو میری ٹھکرائی ہوئی

اے سکوتِ شب نہیں تجھ سے کوئی شکوہ نہیں
ہے طبیعت شام سے پہلے کی اکتائی ہوئی

پھول بھی کھلتے ہیں تو آتی ہے رونے کی صدا
دل کی مٹی میں ہے کوئی چیخ دفنائی ہوئی

ہاں انھیں ویرانیوں میں جشن ماضی بھی ہوا
ہاں انھیں تنہائیوں میں بزم آرائی ہوئی

شآد جب تک ضبط کا یارا تھا سب کچھ ٹھیک تھا
اور جب برسی تو کیا برسی گھٹا چھائی ہوئی

اگر طے کر لیا ہو زندگی نے در بہ در کرنا
تو پھر ممکن کہاں اپنے لیے کوئی سفر کرنا؟

میں عاجز آ چکا ہوں اپنی غیرت کی نصیحت سے
یہ کہتی ہے کہ جو کرنا وہ مجھ سے پوچھ کر کرنا

مری مٹی تجھے چوموں کہ آنکھوں سے لگاؤں میں
ترا ہی حوصلہ ہے ایک کونپل کو شجر کرنا

بہت سمجھایا میں نے حاشیوں کی کیا ضرورت ہے
مگر وہ چاہتا تھا داستاں کو مختصر کرنا

مجھے معلوم ہے میرے بنا وہ رہ نہیں سکتا
کہیں بھٹکا ہوا مل جائے تو مجھ کو خبر کرنا

وہ مجھ میں ہوگیا داخل تو پھر میں اور کیا کرتا
صدف کا کام ہی ہوتا ہے قطرے کو گہر کرنا

یہی کارِ سخن ہے شآد کچھ انجانی راہوں پر
کسی نادیدہ منزل کا تعاقب عمر بھر کرنا

اس طرح خود پر مسلط دل کی بے زاری نہ کر
وقت ہی تو ہے ، گزر جائے گا، جی بھاری نہ کر

دشت شب کے پار ہی لے جانا ہے اک خواب کو
اک سفر کے واسطے اب اتنی تیاری نہ کر

دل ابھی پوری طرح منکر نہیں ہے دین کا
میں ابھی کافر نہیں فتوی کوئی جاری نہ کر

تو بھی تو ٹوٹا ہوا ہے اپنے غم کی مار سے
اب کسی بکھرے ہوئے کی اتنی غم خواری نہ کر

اک ہوا آئے گی اور ان کو اڑا لے جائے گی
بت یہ سب ہیں ریت کے ، ان کی پرستاری نہ کر

روز تو دنیا سے ملتا ہے نئے اک بھیس میں
میں ترا کردار ہوں، مجھ سے اداکاری نہ کر

شآد یہ دنیا اگر غافل سمجھتی ہے تجھے
بے خبر تو بھی گزر جا، کوئی ہشیاری نہ کر

وہ جس مرکز سے تھے منسوب اس سے ہٹ چکے ہیں
ادھر کچھ دن سے ہم ہر رابطے سے کٹ چکے ہیں

اسی محدود صفحے پر لکھیں اپنی کہانی
کہ ہم دونوں طرف سے حاشیوں میں بٹ چکے ہیں

بھرم رکھا ہوا ہے دھوپ میں سائے نے اپنا
وگرنہ ہم قد و قامت میں کب کے گھٹ چکے ہیں

وہی سورج سے لے کر چاند تک لمحوں کا چلنا
ہمیں ان روز و شب کے سب مناظر رٹ چکے ہیں

مٹھی میں کرچیوں کو ذرا دیر بھینچ لو
پھر اس کے بعد پوچھنا کیسے جیا ہوں میں؟

شیشہ ہوں جس کی پرلی طرف زنگ ہے بہت
دنیا سمجھ رہی ہے مگر آئنہ ہوں میں

نذر غالب

جب ایک ہی چارہ بچا مرنا مرے آگے
پھر آکے کھڑی ہوگئی دنیا مرے آگے

میں جس کے سبب توڑ چکا آئنہ خانہ
لے آئے ہو پھر کیوں وہی چہرہ مرے آگے؟

کب تک میں یوں ہی اپنی پناہوں میں رہوں گا
کب تک چلے گا یہ مرا سایہ مرے آگے؟

فردا ترے لمحات پہ کس طور یقیں ہو؟
جب لمحۂ موجود نہ ٹھہرا مرے آگے

پلکوں پہ جو اک خواب سجا رکھا ہے میں نے
تو نے بھی اسی خواب کو دیکھا مرے آگے

اک سانحے نے کردیا پتھر رگ و پے کو
پھر دل نہ کبھی زور سے دھڑکا مرے آگے

یہ میرا سفر وقت کے برعکس ہے شاید
فردا مرے پیچھے ہے، گذشتہ مرے آگے

چپ چاپ تماشائی بنا دیکھ رہا ہوں
" ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے "

تری فطرت کو ان دیکھا نہ جانے کیسے کرتے ہیں؟
یقیں ہر بار ہم تیرا نہ جانے کیسے کرتے ہیں؟

در و دیوار تو ہوتے نہیں ان کے نشیمن میں
پرندے گھر کا بٹوارا نہ جانے کیسے کرتے ہیں؟

ہمارے ظرف پر حیران تو ہوگا یہ صحرا بھی
بکھر کر ، خود کو ہم یکجا نہ جانے کیسے کرتے ہیں

ہوا کے دوش پر اڑنا کوئی آساں نہیں ہوتا
سفر یہ لوگ آوارہ نہ جانے کیسے کرتے ہیں

جہاں پر نیند کا دامن پکڑ لیتی ہیں سب آنکھیں
ہم اس عالم میں بھی جاگا نہ جانے کیسے کرتے ہیں

ہمارے سامنے جب آئینہ ہوتا ہے غیرت کا
ہم اس چہرے کو اک چہرہ نہ جانے کیسے کرتے ہیں؟

بہت آسان ہے اس غار میں گہرا اتر جانا
اداسی سے مگر ابھرا نہ جانے کیسے کرتے ہیں؟

کہ ہم تو تھک چکے ہیں شادؔ اپنے ہی تعاقب میں
یہاں سب وقت کا پیچھا نہ جانے کیسے کرتے ہیں

کتنے مہنگے پڑے حقیقت میں
خواب دیکھے گئے جو عجلت میں

کوئی صورت نہیں ہے بچنے کی
آج پیشی ہے دل عدالت میں

اس کو تصویر کرنا مشکل ہے
جو اداسی ہے تیری رنگت میں

بات تو تھی جہاں، وہیں پر ہے
ہم کہیں کھو گئے وضاحت میں

یہ جو اہل خرد کی حالت ہے
اس سے بہتر تھے ہم تو وحشت میں

سوچتا ہوں کہ بھول جاؤں اسے
وہ جو شامل ہے میری عادت میں

وقت کا کچھ پتہ نہیں چلتا
اتنا مصروف ہوں میں فرصت میں

شور کہتا ہے تو صداؤں کو
نقش کچھ ہے تری سماعت میں

بات کو مختصر ہی رکھنا تھا
رائگاں ہو گئی وضاحت میں

زندگی کیوں گزار دی جائے
ایک امید ایک حسرت میں

یہ اپنے آپ کو جو اک تماشا کررہا ہوں میں
بہت مجبور ہو کر ہی تو ایسا کررہا ہوں میں

مجھے معلوم ہے اک دن مری تائید بھی ہوگی
ابھی تو جو جسارت ہے وہ تنہا کر رہا ہوں میں

اگر اس دل کی سن کر ہی پشیماں ہونا پڑتا ہے
تو اک نامعتبر پر کیوں بھروسا کر رہا ہوں میں؟

ابھی تعبیر کی صورت نہیں دیکھی ان آنکھوں نے
ابھی تو اپنے خوابوں ہی کا پیچھا کر رہا ہوں میں

سفر سے قبل یکجا کر لیا تھا جن سرابوں کو
اب ان کے واسطے تخلیق صحرا کر رہا ہوں میں

اگر برہم ہے مجھ سے آئنہ تو خود صفائی دوں
کسی کے عکس کو کیوں اپنا چہرہ کررہا ہوں میں؟

ہے میرے پاس جتنا بھی اثاثہ شآد ماضی کا
اسی بنیاد پر تعمیر فردا کررہا ہوں میں

کش مکش کے دائروں کے پار جانا بھی تو ہے
فیصلہ کر تو لیا، اس کو بتانا بھی تو ہے

ان شکستہ بال و پر سے ورنہ اُڑ سکتا ہے کون؟
کیا کروں میری ضرورت آب و دانہ بھی تو ہے

بند آنکھوں سے کئے تھے دستخط جس عہد پر
بے دلی سے ہی سہی، اس کو نبھانا بھی تو ہے

دل کی خوشیوں پر توجہ کس طرح قائم رہے؟
ذہن میں کچھ الجھنوں کا تانا بانا بھی تو ہے

اس سے پہلے اور بکھرائے کوئی جھونکا مجھے
اپنے گرد و پیش سے خود کو اٹھانا بھی تو ہے

ورنہ یہ دنیا کہاں تسلیم کرتی تھی مجھے؟
خود کو منوانے کی خاطر اس کو مانا بھی تو ہے

یاد اک خوشبو کی صورت شاد کرتی ہے مگر
ایک شیوہ اس کا اکثر دل دکھانا بھی تو ہے

دشت میں اک اپنے ہی جیسے سے مل کر رو پڑا
ایک پیاسا، دوسرے پیاسے سے مل کر رو پڑا

ایک ماضی کے کھنڈر سے یاد اٹھا لائی جسے
لمحۂ موجود اسی لمحے سے مل کر رو پڑا

یہ شباہت لے کے لوٹے گا کہاں معلوم تھا؟
آئنہ بچھڑے ہوئے چہرے سے مل کر رو پڑا

آج پھر تعبیر نے اس کو شکستہ کر دیا
آج پھر اک خواب اک دھوکے سے مل کر رو پڑا

ایسے منظر روز صحراؤں میں دکھتے ہیں یہاں
کوئی پیکر جب کسی سائے سے مل کر رو پڑا

وہی اک آگ کی صورت تہِ خاشاک نکلا
جسے معصوم سمجھے تھے بہت چالاک نکلا

یہاں تو ہر شجر میں چھپ کے بیٹھی ہیں ہوائیں
یہ میں کن راستوں میں لے کے اپنی خاک نکلا؟

مرے احساس کو اس نے بہت دھوکا دیا ہے
وہ رشتوں کے حوالے سے بہت سفاک نکلا

وہی جو خواب آنکھوں کو بہت پیارا لگا تھا
ڈھلا تعبیر میں تو کیسا عبرت ناک نکلا؟

یہ کچھ ہنستے ہوئے چہرے، یہ کچھ روتی سی آنکھیں
ہوئی تصدیق تو سب کا گریباں چاک نکلا

میں شامل ہوگیا تھا بے وضو عجلت میں پھر بھی
نمازِ عشق میں میرا ہی سجدہ پاک نکلا

ہوا قریب سے گزرے تو کانپ جاتا ہوں
میں اپنی ذات میں شعلے دبائے بیٹھا ہوں

ہے میرے چاروں طرف بھیڑ آشناؤں کی
مگر میں حدنظر تک بہت اکیلا ہوں

یہ خواب دیکھ رہا ہوں ادھر کئی دن سے
میں کچھ مہیب سے چہروں کے بیچ بیٹھا ہوں

انھیں ادھڑنے کی عادت ہے سو ادھڑتے ہیں
مرا تو شیوہ یہی ہے کہ خواب بنتا ہوں

میں جس سے جڑتا ہوں وہ مجھ کو توڑ دیتا ہے
میں بے غرض ہوں مگر بدنصیب رشتہ ہوں

مجھے خود اپنے توازن پہ اعتماد نہیں
سو احتیاط سے اب سیڑھیاں اترتا ہوں

وگرنہ میں کہاں نقش و نگار میں آتا؟
یہ خد و خال کی ضد تھی تو ایک چہرہ ہوں

چلا گیا وہ یقیں کو مرے گماں کر کے
غلط کیا ہے بہت اس کو رازداں کر کے

یہ سوچتا ہوں محبت نے کیا دیا مجھ کو؟
اب ایک عمر محبت میں رائگاں کر کے

میں چاہتا تھا نہ پھیلے مزید آگ اس کی
بجھا مگر وہ مری ذات میں دھنواں کر کے

یہیں پہ ختم کریں اس کو فائدہ کیا ہے
طویل اور تعلق کی داستاں کر کے؟

بہت حسیں ہیں یہ تنہایاں مگر ان کو
ابھی کچھ اور سنواروں اداسیاں کر کے

وہ چاہتا ہے کہ سالم بھی میں دکھائی دوں
مرے وجود کو بے طرح دھجیاں کر کے

کہا یہ درد نے مجھ سے نظر ملا تو سہی
تو شاؔد ہو تو گیا زخم کو نشاں کر کے

مری طلب کو وہاں بے حیائی سمجھا گیا
جو حق بھی مانگا تو اُس کو گدائی سمجھا گیا

بیان تلخ تھا میرا ذرا مگر سچ تھا
مرے بیان کو شعلہ نوائی سمجھا گیا

اب اور کتنا نبھاتا میں اس تعلق کو
کہ ابتدا میں جسے انتہائی سمجھا گیا

بس اس لیے کہ میں لفظوں سے دور رہتا ہوں
مرا سکوت مری بے نوائی سمجھا گیا

یہی تو اصل خسارہ تھا خوش لباسی کا
جو منتشر تھا اسے بھی اکائی سمجھا گیا

اس اک گمان نے کیا کیا یقیں کو دھوکے دیے
کہ رسم و راہ کو بھی آشنائی سمجھا گیا

یہ جو غم گین بن کر تجھ کو روتا دیکھتے ہیں
یقیں کر سب ترے غم کا تماشا دیکھتے ہیں

وہی سمجھیں گے کتنی عارضی ہے یہ بلندی
جو سورج کو نشیبوں میں اترتا دیکھتے ہیں

یہ کیسی بے بسی ہے آبگینوں کو بنا کر
ہوا کے ہاتھ پھر ان کو شکستہ دیکھتے ہیں

یہ صحرا کب تلک حساس رہ سکتے ہیں آخر
کہ دن بھر اک نہ پیاسے کو مرتا دیکھتے ہیں

کبھی منکر بھی ہو جاتے ہیں ہم اس آئنے کے
کبھی بے چارگی سے اپنا چہرہ دیکھتے ہیں

کسی مخصوص منزل کا تعاقب کرتے کرتے
اچانک خود کو ہم بے سمت ہوتا دیکھتے ہیں

کیا بتاؤں کس قدر سب نقش تھے سہمے مرے
دھوپ تھی تصویر پر اور رنگ تھے کچے مرے

اے مرے عہد گذشتہ یاد تو ہوگا تجھے
اس خرابے میں کبھی کچھ لوگ رہتے تھے مرے

مجھ کو اس آسودگی میں بھی ابھی تک یاد ہیں
کس طرح محرومیوں میں دن وہ گزرے تھے مرے

تو نے ان کو بھی سمندر اپنے جیسا کر دیا
کیسے میٹھے پانیوں کے صاف چشمے تھے مرے

موم کا تھا جسم میرا اور اس پر یہ ستم
دھوپ نے رکھے ہوئے تھے رہن سب سائے مرے

شاؔد یہ بے خوابیاں ان کو اپاہج کر گئیں
نیند کی بیساکھیوں پر خواب چلتے تھے مرے

وہ خواب بستہ رات کچھ ایسے بسر ہوئی
آنکھوں کو بھی یقیں نہ ہوا جب سحر ہوئی

جب تک تھی میری خاک کے ہم راہ تھی بخیر
چھوڑا مجھے تو خود وہ ہوا در بہ در ہوئی

چہرے پہ جب سجانے لگا مسکراہٹیں
دل کی اداسیوں کی مجھے تب خبر ہوئی

وحشت کو اپنے ساتھ میں لایا تھا دشت سے
کچھ یوں گھلی ملی مرے گھر سے کہ گھر ہوئی

پہلے مرے وجود کو اس نے بنایا راکھ
جب بجھ گئی وہ آگ تو مجھ میں شرر ہوئی

اب تو ہے شاؔد بس یہ میری ذات کائنات
سمٹی جو داستاں تو بہت مختصر ہوئی

مرے ہونے کے اک احساس کو وسعت بھی ملتی ہے
اکیلے پن میں اپنی ذات کی قربت بھی ملتی ہے

خیالوں کے تعاقب میں سفر کرتی ان آنکھوں کو
نئے منظر تو ملتے ہیں، نئی حیرت بھی ملتی ہے

کسی شانے پہ سر رکھ کر کبھی رونا بھی اچھا ہے
کہیں دکھ بانٹ لینے سے ذرا راحت بھی ملتی ہے

سفر کی ابتدا کرنے سے پہلے سوچ لے اتنا
سفر صحراؤں کا ہو تو وہاں وحشت بھی ملتی ہے

ذرا سا صبر رکھنا کاروبار عشق میں، اس میں
بھلے گاہک بھی ملتے ہیں، کھری قیمت بھی ملتی ہے

تجھے جب دیکھتا ہوں میں تو خود کو یاد آتا ہوں
کہ تیرے حال سے کچھ کچھ مری حالت بھی ملتی ہے

وہ جو بیٹھا ہے تجھ میں شاد کب سے منتظر تیرا
بتا کیا اس سے ملنے کی کبھی فرصت بھی ملتی ہے؟

مرے درپیش اک خواہش کا صحرا روز ہوتا ہے
سرابوں کے چھلاوے سے گزرنا روز ہوتا ہے

کسی لمحے ابھرتا ہوں کسی پل ڈوب جاتا ہوں
مرے احساس میں یہ اک تماشا روز ہوتا ہے

کسی ٹھوکر سے بکھرے یا کہ سوچیں منتشر کردیں
مرے دل کو کسی صورت بکھرنا روز ہوتا ہے

شناسا راستوں پر روز کرتا ہوں سفر پھر بھی
کہیں کھو جانے کا اس دل کو دھڑکا روز ہوتا ہے

پہاڑوں نے جکڑ رکھا ہے مجھ کو برف میں ورنہ
زمینوں پر اترنے کا ارادہ روز ہوتا ہے

مرے اطراف میں کوئی نظر آتا نہیں لیکن
مرے ہمراہ پھر بھی کوئی سایہ روز ہوتا ہے

گتھی الجھ رہی تھی بہت نفسیات کی
کچھ الجھنیں تھیں جسم کی اور کچھ تھیں ذات کی

آخر کوئی تو فیصلہ کرنا ہی تھا مجھے
کل خود سے میں نے اپنے ہی بارے میں بات کی

تم کو نہ آئے نیند تو ہے اس کا کیا قصور؟
سورج سے کیوں شکایتیں کرتے ہو رات کی؟

آنکھوں پہ اتنا بوجھ ہے خوابوں کا ان دنوں
اب چاہتی ہیں یہ کوئی صورت نجات کی

ہم پھر بھی تیرے حلقہ جادو میں آ گئے
اپنی طرف سے یوں تو بہت احتیاط کی

یہ خاموشی تو بس اک ساعت اظہار ہی تک ہے
ترا پندار میری جرأت انکار ہی تک ہے

اشارے روز کرتا ہے نئے امکان کے، دریا
سفر تیرا مگر اِس پار سے اس پار ہی تک ہے

تصور میں، میں ساتوں آسماں تسخیر بھی کرلوں
بظاہر تو مرا قبضہ درو دیوار ہی تک ہے

یقیں تو کر ذرا تخلیق کی سوکھی زمیں مجھ پر
تری یہ پیاس بس بارش کی پہلی دھار ہی تک ہے

بس اپنی ذات ہی کے دائرے میں بے کراں ہے تو
تجھے لگتا ہے یہ دنیا ترے افکار ہی تک ہے

کئی اصنافِ فن کے در مقفل ہیں ابھی ہم پر
رسائی جو بھی ہے اپنی سو ان اشعار ہی تک ہے

نئی اک سمت کی جانب وہیں سے راستہ نکالا
جسے منزل سمجھ بیٹھے تھے وہ تو مرحلہ نکلا

مرے باطن سے بڑھ کر ہوگیا روشن مرا ظاہر
صدف حیرت زدہ ہے یہ مرے سینے سے کیا نکلا؟

کیا جب اپنی آشفتہ سری کا تجزیہ میں نے
سبب اس کا ضرورت سے زیادہ سوچنا نکلا

میں اس کے رکھ رکھاؤ کے ہی دھوکے میں رہا اب تک
بہت سیراب لگتا تھا مگر صحرانما نکلا

کسی نے شاؔد کب لکھی مکمل داستاں اپنی
کتاب زندگی کے ہر ورق پر حاشیہ نکلا

بہت مصروف ہوں، کہہ دو ابھی بیٹھی رہے دنیا
مری تنہائیوں سے وقت لے کر پھر ملے دنیا

گر ان میں گھٹ کے مر جاؤں تو دنیادار کہلاؤں
یہ جالے توڑ دوں رشتوں کے تو باغی کہے دنیا

زمیں محدود ہے اور آسماں بھی تنگ ہے اس کا
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہاں کیسے رہے دنیا؟

اسے کہہ دو کہ میں جس مرحلے پر ہوں وہیں خوش ہوں
اب اپنی سمت خود طے کر لے اور چلتی رہے دنیا

غلط کیا تھا اگر اک شور کا حصہ نہیں تھا میں
مری خاموشیوں کا تجزیہ اب خود کرے دنیا

میں سب پردے ہٹا دیتا ہوں جب اپنوں سے ملتا ہوں
اگر ملنا ہے تو میری طرح مجھ سے ملے دنیا

نظرانداز کرکے بھی اسے میں شآد رہتا ہوں
اب اپنے زعم پر اس ضرب کو کیسے سہے دنیا؟

تیرے دامن پر لہو یہ تیرا کیا ثابت کرے
تجھ پہ ہے اب خود کو کیسے بے خطا ثابت کرے

یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہی بجھ گئے ہوں یہ چراغ
بے گناہی کس لیے اپنی ہوا ثابت کرے؟

تیرے سجدے بھی روا، تیری عبادت بھی قبول
شرط یہ ہے خود کو تو پہلے خدا ثابت کرے

اپنے خدوخال کی خود ہی گواہی دوں گا میں
کیوں مری پہچان کوئی دوسرا ثابت کرے؟

شآد اک مدّت سے اس کوشش میں ہوں میری صدا
شہر کے اس شور سے خود کو جدا ثابت کرے

ہر ایک حد سے میں بکھراو کی گزر بھی گیا
میں اپنی شاخ سے ٹوٹا بھی اور بکھر بھی گیا

یہ غوطہ زن بھی کسے ڈھونڈنے کو آئے ہیں
وہ ایک شخص جو ڈوبا تھا، پار اتر بھی گیا

جو تونے دائمی کہہ کر عطا کیا تھا کبھی
تجھے خبر ہی نہیں ہے وہ زخم بھر بھی گیا

یہ کیسا زہر پلایا ترے تعلق نے
لہو میں اترا نہیں اور کام کر بھی گیا

بغیر جس کے تصور نہیں تھا جینے کا
میں شآد زندہ ہوں اب تک وہ شخص مر بھی گیا

خواہشوں کی انتہا تک یہ ہوس پہنچائے گی
جس قدر سیراب ہوگا پیاس بڑھتی جائے گی

گر اداسی روح میں سُلگی تو مہکے گی ضرور
جسم کی آرائشوں میں کب تلک چھپ پائے گی؟

گر یوں ہی کرتا رہا تو ان صداؤں سے گریز
تجھ کو اک دن یہ خموشی در بہ در بھٹکائے گی

چھوڑ دے ، کچھ دیر ان آنکھوں کو تنہا چھوڑ دے
اتنے خوابوں سے گھرا ہے، نیند کیسے آئے گی؟

دیکھ کتنے بدنما ہیں رنگ تیرے عکس کے
زندگی اب ایسے چہرے پر بھی تو اترائے گی؟

اک نئی کونپل نے دستک دی برہنہ شاخ پر
کچھ اداسی تو شجر کی شاؔد کم ہو جائے گی

میں تو گرد راہ میں تھا، آسماں تک آ گیا
بے خودی کچھ تو بتا کیسے یہاں تک آ گیا؟

ہوگئی تسلیم آخر اک پرندے کی دعا
ٹوٹتی سانسیں سمیٹے آشیاں تک آ گیا

پہلے وہ داخل ہوا آنکھوں میں چہرے کی طرح
پھر نہ جانے کون سے رستے سے جاں تک آ گیا؟

اب بھی کیا تجھ کو نہیں ہے اپنے جلنے کی خبر؟
دیکھ لے آنکھوں میں تیری اب دھواں تک آ گیا

یاد کرتا ہوں وہ گمنامی سے شہرت کا سفر
میں وہاں سے کب چلا تھا، کب یہاں تک آ گیا؟

شآد رکھنا پڑتا ہے ایک ایک جذبے کا حساب
کیا کریں اب عشق بھی سود و زیاں تک آ گیا

یاد تجھے شاید آجائے نظرثانی میں
اک کردار ہوا کرتا تھا تیری کہانی میں

ایک نہ اک سامان تو پیچھے چھوٹ ہی جاتا ہے
یہ نقصان تو ہوتا ہی ہے نقل مکانی میں

شاید اس کی فطرت میں تبدیلی آجائے
ہم نے اک پتھر کو رکھا برسوں پانی میں

اپنے خار و خس ہونے کا تب احساس ہوا
وقت کا دریا جب لہرایا ہے طغیانی میں

سوچا تھا آسان سے لفظوں میں سب کہہ دیں گے
لیکن کتنی دشواری تھی اس آسانی میں

شہر کے شور و غل میں تو افسردہ لگتی ہے
خاموشی کا حسن کبھی دیکھو ویرانی میں

اب بھی اک خواہش کی ڈھلتی دھوپ کا سایہ ہے تو
بے نیازی میں بھی کب دنیا سے کٹ پایا ہے تو؟

ہاں وہی آئنہ ہوں میں جس سے نفرت تھی تجھے
کون سا منہ لے کے میرے سامنے آیا ہے تو؟

آبگینوں کے بکھرنے کا تماشا دیکھ لے
دیکھ لے کن رائیگاں خوابوں پہ اترایا ہے تو

تیری قیمت کچھ بھی ہو بازار میں پر یاد رکھ
ساری زیبائی صدف کی کوکھ سے لایا ہے تو

اک جنون رائیگاں کو آگہی کہتا رہا
ذہن و دل کی کشمکش میں کتنا بھرمایا ہے تو

ہر طرف بکھری پڑی ہیں کیوں یہ تیری دھجیاں؟
کن تمناؤں کی چٹانوں سے ٹکرایا ہے تو؟

تو نے سب سونا لٹا ڈالا ہے اپنی دھوپ کا
شب کے غاروں میں پڑا اب کتنا بے مایہ ہے تو

بے سرو سامانیوں میں بھی تو کرتے ہیں سفر
شادؔ کیوں رختِ گراں گھر سے اٹھا لایا ہے تو؟

تیرگی کا بے کراں گہرا سمندر کاٹ کر
نیند پہنچی ہے سحر تک کتنے منظر کاٹ کر

وہ ترا جادو نگر حائل تھا ہر اک گام پر
میں یہاں آیا ہوں جانے کتنے منتر کاٹ کر

کر دیا سرشار مجھ کو اک ہوا کے لمس نے
حبس کچھ کم ہوگیا دیوار میں در کاٹ کر

اور کتنی بار لکھے گی مجھے تو زندگی؟
یہ نیا کیا لکھ دیا حرفِ مکرر کاٹ کر؟

چاہتا ہے معتبر ہو جائے اس کی برتری
ایک سورج دھوپ سے سایوں کا پیکر کاٹ کر

چہرہ بھی گرد بھول گئی رہگزار کا
جب سے ملا ہے روپ نیا اک غبار کا

کتنی بلندیوں سے اتر کر ملا تجھے
دریا تو قرض دار ہے اک آبشار کا

آپس میں سب لپٹ گئے ذرے وجود کے
دل میں تھا ایسا خوف کسی انتشار کا

ٹوٹے ہوئے پروں کی اذیت کے باوجود
میں رہنما ہوں ایک پرندوں کی ڈار کا

شاخوں سے اب نکلنے لگیں زرد کونپلیں
ایسا کبھی تو رنگ نہیں تھا بہار کا

کوشش کر کے ہار گیا پر ڈھال سکا کب لفظوں میں
وہ احساس کہ اک رشتہ جب ٹوٹ کے بکھرا کرچوں میں

میں بھی کب تک ساتھ نبھاتا اک خودغرض تعلق کا؟
آخر کب تک چل سکتا تھا پتھر باندھ کے پیروں میں؟

ظاہر کے سب رنگ الگ ہوں، باطن کے کردار الگ
رہ سکتا ہے کیسے کوئی بٹ کر اتنے خانوں میں؟

جانے کس منحوس گھڑی میں قرض لیا تعبیروں سے
جو بھی تھی خوابوں کی پونجی صرف ہوئی سب قسطوں میں

ہم نے ان کچی عمروں میں جیون کے دکھ جھیلے ہیں
جن عمروں میں رکھتے ہیں سب مور کے پنکھ کتابوں میں

شاؔد سمندر کی موجیں بھی چاند کے عشق میں پاگل تھیں
چاند تو لیکن ڈوب چکا تھا جھیل کی گہری آنکھوں میں

دھوپ نے یہ پھر کہا رخ میری جانب موڑ کر
کب تلک بچ پائے گا تو ایک سایہ اوڑھ کر

آسمانوں کی بلندی میں کہاں آیا خیال؟
اک نشیمن بھی بنالوں چار تنکے جوڑ کر

بے یقینی نے یہ کیسا خوف مجھ میں بھر دیا؟
اب کہیں جاتا نہیں میں خود کو تنہا چھوڑ کر

کم سے کم دستک ہی دے کر دیکھ لیتا ایک بار
مجھ میں داخل کیوں ہوا وہ شخص مجھ کو توڑ کر

مری مرضی کے مجھ کو رنگ دے دے
تو پھر تصویر میری ذمے داری

تو اپنے خواب میرے نام کر دے
ہر اک تعبیر میری ذمے داری

اگر میں اپنی نظروں میں ذرا سا کم ہی ہو جاتا
تو پھر اس دھوپ کی پرچھائیوں میں ضم ہی ہو جاتا

میں اپنی ذات کی سرگوشیوں کی بات سن لیتا
اگر اطراف کا یہ شور کچھ مدھم ہی ہو جاتا

اگر یوں بے دلی سے مسکرا کر روز ملنا تھا
تو پھر اس سے تو اچھا تھا کہ وہ برہم ہی ہو جاتا

کسی گھنگھور بادل کے تلے آرام کر لیتے
کبھی اس بے کراں صحرا میں وہ موسم ہی ہو جاتا

سمندر سے بھی تو یہ دھوپ آخر لے اڑی مجھ کو
برا کیا تھا اگر اک پھول پر شبنم ہی ہو جاتا؟

برسنے کا سلیقہ ہی نہیں آیا ان آنکھوں کو
وگرنہ عین ممکن تھا وہ پتھر نم ہی ہو جاتا

سبب ہے شاؔد یہ تیری انا جڑ سے اکھڑنے کا
اگر آندھی مقابل تھی تو تھوڑا خم ہی ہو جاتا

ابھی سے جشن کا عالم ہے کیوں ستاروں میں؟
ابھی میں ٹھیک سے ڈوبا نہیں ہوں غارو میں

مرا وجود سمندر سے آملا ہے مگر
میں رہ گیا ہوں کہیں دور آبشاروں میں

کسی تلاش مسلسل نے کر دیا تنہا
وگرنہ میں بھی کبھی تھا تمھاری ڈاروں میں

پکڑ لے دھوپ کی انگلی اور آسماں ہو جا
نہیں تو بہتا رہے گا یونہی کناروں میں

نہ جانے دشت کی وحشت ہے یا ہواؤں کی
کہ امتزاج ہے دونوں کا ان غباروں میں

بتا رہی ہے لہو سے سنی ہوئی مٹی
بھٹک گیا تھا کوئی رات خارزاروں میں

وہ آگ بجھ تو گئی شآد پر تپش اپنی
چھپا کے رکھ گئی کچھ ان بجھے شراروں میں

کون سمجھے گا کہ خود کو کس طرح یکجا کیا
وقت نے جب منتشر خوابوں کا شیرازہ کیا

آج اس کو خوش گمانی ہے کہ اک پیکر ہے وہ
ہم نے جس سائے کو اپنے جسم سے پیدا کیا

میں نے جب ناکامیوں کی ساری شرطیں مان لیں
پھر امیدو! تم نے میرے ساتھ کیوں دھوکا کیا؟

کیا بتائیں خواب اور بے خوابیوں کے درمیاں
پار کیسے رات کی کشتی نے وہ دریا کیا

جس طرح بادل برستے ہیں زمیں پر ٹوٹ کر
اس طرح دونوں نے دل کے بوجھ کو ہلکا کیا

گر یقیں مجھ پر نہ ہو تو پوچھ لو تم دھوپ سے
اس شجر نے کٹ کے گر جانے تلک سایہ کیا

کس اذیت سے پہنچتا ہے فلک سے غار تک
میں نے اس سورج کا ڈھل جانے تلک پیچھا کیا

زہر کی تاثیر کم کرنے کو بدلا ذائقہ
تلخیوں میں خواب گھولے اور انہیں میٹھا کیا

عمر بھر کرتے رہے پامال رستوں پر سفر
شاؔد تم نے شاعری کے نام پر بھی کیا کیا

صدائے دل نہ سنوں اور خودی کو مار دوں کیا؟
یہ اک لباس جو ہے جسم پر اتار دوں کیا؟

بہت سے لوگ تماشائی بن کے آئے ہیں
تجھے ڈبونے سے پہلے ذرا ابھار دوں کیا؟

یہ زندگی ہی مرا آخری اثاثہ ہے
اسے بھی داؤ پہ رکھ دوں اسے بھی ہار دوں کیا؟

تو میری بات نہ کہہ پایا اپنے لفظوں میں
اب اپنا طرز تکلم بھی کچھ ادھار دوں کیا؟

یہ زندگی جو ترے ساتھ شاد رہ نہ سکی
ترے بغیر اسے رائیگاں گزار دوں کیا؟

اسی موسم میں اکثر فاختائیں لوٹ آتی ہیں
کہ جس موسم میں پیڑوں کی قبائیں لوٹ آتی ہیں

گلے لگ کر بہت روتی ہیں پھر تپتی زمینوں سے
پہاڑوں سے اتر کر جب ہوائیں لوٹ آتی ہیں

میں محو گفتگو ہوں خود سے ان خاموش غاروں میں
جہاں سے گونج بن کر سب صدائیں لوٹ آتی ہیں

مسلسل اک اندھیرا ہو تو اکثر یہ بھی ہوتا ہے
بجھی آنکھوں میں گم گشتہ شعاعیں لوٹ آتی ہیں

مرا اپنے عقیدوں سے یقیں اٹھنے سا لگتا ہے
کبھی جب آسمانوں سے دعائیں لوٹ آتی ہیں

چلی جاتی تو ہیں اصرار پر اکثر ہواؤں کے
مگر برسے بنا بھی یہ گھٹائیں لوٹ آتی ہیں

شاید مری اجڑی ہوئی نیندوں کا سبب ہیں
مایوس سے یہ خواب جو اظہار طلب ہیں

دیکھا تو کہیں ہم سے بھی ٹوٹے ہوئے نکلے
ہم جن کو سمجھتے تھے کہ یہ اہل طرب ہیں

تعبیر میں ڈھلنے کی بھی کوشش نہیں کرتے
خوابوں سے بہل جاتے ہیں یہ لوگ عجب ہیں

ہم دھوپ ہیں سورج سے تعلق ہے ہمارا
مانا کہ پسِ پردۂ تاریکیٔ شب ہیں

سو بھیس بدلتی ہیں تمنائیں ہماری
ہم پیکر احساس ہیں اک رنگ میں کب ہیں؟

کہنے کو ہمیں شاؔد کہا کرتی ہے دنیا
اپنا بھی وہی حال ہے جس حال میں سب ہیں

بہل سکی نہ اداسی کسی مسرت سے
یہ رنگ ہوتا نہیں اب جدا طبیعت سے

کس اشتیاق سے تکتا تھا میں ستاروں کو
اب اپنے گرد انہیں دیکھتا ہوں حیرت سے

شجر کو دھوپ نے باہوں میں بھر کے چوم لیا
"ہوئی ہے چھاؤں یہ پیدا ہماری قربت سے "

یہ چاہتے ہیں کہ تحریر درد کو بھی کریں
مگر گریز بھی کرتے ہیں ہم اذیت سے

بتائے کھل کے بھلا برف کیسے سورج کو؟
کہ وہ پگھلتی ہے کس درجۂ حرارت سے

کہا یہ رات نے آنکھیں ملا کے تاروں سے
چمک رہے ہیں یہ جگنو مری اجازت سے

ہے شاؔد شب کی خموشی کے پاس سارا حساب
کہ کون کیسے گزرتا ہے اپنی وحشت سے؟

جو صرفِ خوں ہوا ہے وہ دل کی دکاں سے ہے
اپنی گزر بسر اسی کارِ زیاں سے ہے

اب تک بچا ہوا ہے مرا کاغذی بدن
شکوہ یہ بارشوں کو کسی سائباں سے ہے

اپنے سروں پہ دونوں اگر ٹھیک ہیں تو پھر
ٹوٹا ہوا یہ ربط کہیں درمیاں سے ہے

خوش فہمیوں میں جی لے مرے دل نے یہ کہا
جب تک تو بے خبر مرے دردِ نہاں سے ہے

اک جست کا سفر ہے کسی فکر کے لیے
یہ جو نظر کا فاصلہ اس آسماں سے ہے

حائل ہیں شاؔد کیوں مرے فردا کی راہ میں؟
باقی حساب جن کا مرے رفتگاں سے ہے

پھر کبھی آنکھوں کے ساحل پر اسے دیکھا نہیں
آنسوؤں میں ڈوب کر چہرہ وہ پھر ابھرا نہیں

تم تو بس جھرنوں کے نغموں کی صدا سنتے رہے
کٹتے جاتے پتھروں کے کرب کو سمجھا نہیں

جانے یہ کیسا تعلق ہوگیا اس شخص سے
اب تلک جس سے تعارف کا بھی تو رشتہ نہیں

اب تو باطن کی صداؤں نے بھی چپ سادھ لی
بولنے سے فائدہ کیا جب کوئی سنتا نہیں؟

حسرتیں پر تولتی ہیں شاؔد لیکن کیا کریں
ان شکستہ بال و پر سے تو اڑا جاتا نہیں

یہ ممکن ہے کہ میرا زعم یہ بھی جبر کر جائے
انا زندہ رہے میری، ترا احساس مر جائے

یہ جن رنگوں سے تونے خال و خد اس کے سنوارے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو تصویر کا چہرہ اتر جائے

ادھر یہ خشک پتے اور ادھر صحرا کی آوازیں
ہوا اس کشمکش میں ہے کہ جائے تو کدھر جائے

نئی ٹھوکر کو اس سے کیا ابھی اک چوٹ تازہ ہے
نئے زخموں نے کب سوچا پرانا زخم بھر جائے

جسے تخلیق میں ہر لفظ کو اک شکل دینی ہو
اگر وہ روشنائی کورے کاغذ پر بکھر جائے؟

یہ گھر تاریکیوں کی زد پہ جانے کب سے ہے سورج
اگر کچھ دھوپ تیری دل کے آنگن سے گزر جائے

زباں کی نوک پر بھی رکھ کے مت چکھنا اداسی کو
یہ زہر شب بھروسا کیا رگ و پے میں اتر جائے

مجھے تم مسئلہ اپنا بتاؤ تو خرد والو
یہ ممکن ہے مری دیوانگی کچھ کام کر جائے

بکھرتے وقت شاؔد اس پھول کی اتنی سی خواہش تھی
جہاں تک ہو سکے پہلے مری خوشبو بکھر جائے

صرف جینے کے لیے تو روز مر سکتا نہیں
زندگی اب اور یہ بہروپ بھر سکتا نہیں

پھر بھلا میں کیا مصور ہوں اگر تصویر میں
اپنی مرضی کا کوئی بھی رنگ بھر سکتا نہیں

دیکھ لے اس شخص کو روتا ہوا بھی دیکھ لے
تجھ کو لگتا تھا یہ شیرازہ بکھر سکتا نہیں

اب تو ساحل کی صداؤں نے بھی چپّی سادھ لی
جانتی ہیں ڈوبنے والا ابھر سکتا نہیں

جانے انجانے میں تو نے کچھ پیا تو ہے ضرور
زہر ورنہ خود رگوں میں تو اتر سکتا نہیں

میں، تو نے جیسے بھی چاہا تجھے گزار گیا
تو مجھ سے جیت گئی زندگی میں ہار گیا

میں خشک پتوں میں خود کو چھپائے بیٹھا تھا
وہ ایک جھونکا مری آبرو اتار گیا

یہ کس نے موج مخالف سے بے وفائی کی
ڈبونے آیا تھا مجھ کو مگر ابھار گیا

یہ بات کیسے بتاؤں میں بے یقینی کو
کہ جو یقین تھا خود پر وہی تو مار گیا

اشعار

اب جو بھٹک رہا ہے یہ آشفتہ سر بنا
کس نے کہا تھا دشت میں دیوارو در بنا؟

کیسی بے رنگیوں سے گزرا ہوں
زندگی تجھ میں رنگ بھرتے ہوئے؟

یہ جن نظروں سے میرے عکس نے دیکھا ہے مجھ کو
اسے کچھ دل کی حالت کا بھی اندازہ ہے شاید

اس طرح عجلت میں مت کر فیصلہ کردار کا
تو گزر کر دیکھ میری داستاں سے بھی کبھی

❖❖❖❖

مرا وجود سمندر میں آملا ہے مگر
میں رہ گیا ہوں کہیں دور آبشاروں میں

ا
س اشتیاق سے کیا دیکھتا ہے تو مجھ کو
تو آئنہ ہے تجھے کیا کمی ہے چہروں کی؟

تھکن جو جسم کی ہوتی اتار بھی لیتے
تمام روح تھکا دی ہے اس سفر نے تو

◈◈◈◈◈◈◈

اسی لیے میں اسے بددُعا نہیں دیتا
دُعا کی بات اگر مان لی اثر نے تو؟

◈◈◈◈◈◈◈

میں نے دیکھا ہے حقیقت کے سمندر کا جلال
میں بھی خوابوں کے جزیرے پہ رکا تھا کچھ دن

❖❖❖❖

ایک موج مہرباں کا مجھ پے یہ احسان ہے
خود کو گردش میں پس گرداب رکھتی ہے مجھے

❖❖❖❖

غبار فکر پہلے بے ضرر ہوتا تھا لیکن
یہ لے کر ساتھ اب دل کی زمیں اٹھنے لگا ہے

❖❖❖❖

اتنی دہشت ہے کہ سودائی ہوئے جاتے ہیں
اتنے تنہا ہیں کہ تنہائی ہوئے جاتے ہیں

❖❖❖❖

تم نے اک بات کہی دل پہ قیامت ٹوٹی
اک شرر کم تو نہیں آگ لگانے کے لیے

❖❖❖❖

میں اپنی موت پہ رویا کہاں ہوں جی بھر کے
ملا ہے وقت ہی کتنا ملال کرنے کا

❖❖❖❖

شاؔد کیوں آتے نہیں پیاسے پرندے اِس طرف
کیا مرا پانی سمندر سے بھی کھارا ہو گیا

خوش بیر کو قریب سے دیکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ پر ان کی گم شدگی اور دنیا گریزی ظاہر ہو گئی، ورنہ ممکن تھا کہ انہیں مشاعروں میں آتا جاتا دیکھ کر میں ان کے بارے میں کچھ اور فرض کر لیتا، جو بلاشبہ غلط ہوتا۔ دورِ حاضر میں ہماری شاعری جس بری طرح چھنال پن کی شکار ہوئی ہے اور بیشتر شاعر (ناشاعر) جس فحش انداز سے 'پیشہ'وری میں مبتلا ہیں، اس کے پیشِ نظر شاعر کی شناخت اس کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کا چہرہ اپنے اندر کی طرف گھوما ہوا ہو، حاضری میں بھی غائب نظر آئے، موجودگی میں ناموجود رہے اور 'غیروں' کے ساتھ دیر تک رہ جانے پر سب سے بیزار ہو جائے اور بولتے بولتے اچانک گہری چپ کی چادر اوڑھ لے۔ اور پھر یہ کہ وہ شاعری کے سوا اور کچھ بھی کرنے کا اہل نہ ہو۔

فرحت احساس

Scanned by CamScanner

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی
ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔
مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا
ضروری نہیں ۔
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے
ایڈمن ۔ سید حسین احسن
0344-818-3736
0314-595-1212

غُبار آلود سمتوں کا سُراغ

(غزلیں)

ظفر اقبال

طبع دوم ——— اگست ۱۹۸۸ء

تعداد ——— ایک ہزار

کتابت ——— نذیر ہاشمی

ناشر ——— آفتاب

نظرِ ثانی ——— اقبال صلاح الدین

اہتمام ——— طاہر اسلم گورا

قیمت ——— ۱۵۰/- روپے

مطبع ——— طیب اقبال پرنٹرز، رائل پارک لاہور

اقبال صلاح الدین اکیڈمی، اوکاڑہ

زیرِ اہتمام

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور

نسرین اور آفتاب کے نام

اہلِ طوفاں اب تمہارا دور ہے

کشتگانِ غمزۂ ساحل گئے

مجید امجد

بہت بے سُود ہے، لیکن ابھی کچھ اور دِن مجھ کو
سوادِ صُبح میں رہ کر شمارِ شام کرنا ہے
نشاں دینا ہے مَیں نے کچھ غبار آلود سمتوں کا
کوئی کافی پُرانا راز طشت از بام کرنا ہے

ترتیب

وہی منظر برف برسنے کے، وہی گھڑیاں دُھوپ نکلنے کی
سبھی سلسلہ وار سبیلیں ہیں ترے موسمِ راز میں ڈھلنے کی

یہ جو خواب خیال اُمیدیں ہیں، یہ جو وصل وصال نویدیں ہیں
مرے سال سفر کی کلیدیں ہیں تری روشن راہ پہ چلنے کی

کہیں ساعتِ سبز کا عکس اُڑے، کہیں گریۂ شام کی موج مُڑے
کوئی سعیٔ سعید حجاب میں ہے ترا لمس لباس بدلنے کی

کِسی سان گُمان کرشمے پہ کوئی نقش لبوں کے لرزنے کا
کِسی خواب سراب سمندر میں کوئی لہر لہُو کے اُچھلنے کی

یہ جو زخموں کی پھلجھڑیاں ہیں، یہی صورت کڑیاں ہیں
اِسی خمار خرابے میں مرے گرنے اور سنبھلنے کی

آرام حرام ہے میرے لیے، یہی شام انعام ہے میرے لیے
ترے ہجر کی آگ میں جلنے کی، اِسی آگ میں پھولنے پھلنے کی

وُہی مَیں ہُوں ظفرؔ مری راہ وُہی، مرے دل کا یہ سنگِ سیاہ وُہی
کہیں پردۂ غیب میں صُورت ہو کوئی اِس پتّھر کے پگھلنے کی

غبارِ آرزو میں روشنی ہے
ترے دَم سے لہو میں روشنی ہے

دھندلکا ہے نئی آبادیوں پر
پُرانے کاخ د کُو میں روشنی ہے

ہُوئے جاتے ہیں رَستے خود منوّر
کہ اُس کی جستجو میں روشنی ہے

اندھیرے میں چمک اُٹھتا ہُوں کیونکر
یہ کیسی گفتگو میں روشنی ہے

کِسے مَیں نے پُکارا ہے سرِ شام
ظفرؔ، میرے گلُو میں روشنی ہے

چمکتی وسعتوں میں جو گُلِ صحرا کِھلا ہے
کوئی کہہ دے اگر پہلے کبھی ایسا کِھلا ہے

ازل سے گلشنِ ہستی میں ہے موجود بھی وُہ
مگر لگتا ہے جیسے آج ہی تازہ کِھلا ہے

بہم کیسے ہُوئے ہیں، دیکھنا، خواب اور خوشبُو
گزرتے موسموں کا آخری تحفہ کِھلا ہے

لہُو میں اِک الگ انداز سے مستُور تھا وُہ
سرِ شاخِ تماشا اَور بھی تنہا کِھلا ہے

کہاں خاکِ مدینہ اور کہاں خاکسترِ دِل
کہاں کا پھُول تھا لیکن کہاں پر آ کھِلا ہے

کبھی دِل پر گری تھی شبنمِ اِسمِ محمدؐ
مری ہر سانس میں کلیوں کا مجموعہ کھِلا ہے

یہی روزن بنے گا ایک دن دیوارِ جاں میں
مرے دِل میں ندامت کا جو اِک لمحہ کھِلا ہے

یہیں تک لائی ہے یہ زندگی بھر کی مسافت
لبِ دریا ہُوں مَیں اور وُہ پسِ دریا کھِلا ہے

بکھرتا جا رہا ہے دُور تک رنگِ جُدائی
ظفرؔ، کیا پُوچھتے ہو زخمِ دل کیسا کھِلا ہے

چلو اتنی تو آسانی رہے گی
ملیں گے اور پریشانی رہے گی

اسی سے رونقِ دریائے دِل ہے
یہی اِک لہرِ طوفانی رہے گی

کبھی یہ شوق نا مانوس ہو گا
کبھی وُہ شکل انجانی رہے گی

نکل جائے گی صُورت آئنے سے
ہمارے گھر میں حیرانی رہے گی

سُبک سر ہو کے جینا ہے کوئی دن
ابھی کچھ دن گراں جانی رہے گی

سُنو گے لفظ میں بھی پھڑپھڑاہٹ
لہُو میں بھی پَرافشانی رہے گی

ہمارے گ [illegible] ئے دمف
[illegible] دا اتنی ہی برفانی رہے گی

ابھی دل کی سیاہی زور پر ہے
ابھی چہرے پہ تابانی رہے گی

ظفرؔ، مَیں شہر میں آ تو گیا ہُوں
مِری خصلت بیابانی رہے گی

نہیں کہ ذوقِ سماعت بیاں کے بعد ہُوا
زباں کا معجزہ قطعِ زباں کے بعد ہُوا

سفر کی سمت کا اندازہ اب کی بار مجھے
اگر ہُوا تو کہیں درمیاں کے بعد ہُوا

بڑا مزہ دلِ گُم گشتہ کی تلاش میں ہے
زیاں کا فائدہ ظاہر زیاں کے بعد ہُوا

دلِ تباہ کی اُس نے خبر نہ لی، لیکن
خراب آپ بھی وہ خانماں کے بعد ہُوا

رہا اگرچہ خفا، تھا تو شہر میں موجود
بہت اُداس مَیں اُس بدگماں کے بعد ہُوا

مرے زوال میں موسم کی کوئی قید نہ تھی
خزاں میں ہو نہ سکا جو خزاں کے بعد ہُوا

مجھے پتا نہ چلا، تھا مَیں اپنے خواب میں گُم
شعورِ برق مجھے آشیاں کے بعد ہُوا

اب اِس میں گردِ سفر کا قصور کیا ہے ظفرؔ
روانہ مَیں ہی اگر کارواں کے بعد ہُوا

ابھی آنکھیں کھُلی ہیں اور کیا کیا دیکھنے کو
مجھے پاگل کِیا اُس نے تماشا دیکھنے کو

وُہ صُورت دیکھ لی ہم نے تو پھر کچھ بھی نہ دیکھا
ابھی ورنہ پڑی تھی ایک دُنیا دیکھنے کو

تمنّا کی کِسے پَروا، کہ سونے جاگنے میں
میسّر ہیں بہت خوابِ تمنّا دیکھنے کو

بظاہر مطمئن مَیں بھی رہا اُس انجمن میں
سبھی موجود تھے، اور، وُہ بھی خوش تھا دیکھنے کو

اب اُس کو دیکھ کر دِل ہو گیا ہے اور بوجھل
ترستا تھا یہی دیکھو تو کتنا دیکھنے کو

اب اِتنا حُسن آنکھوں میں سمائے بھی تو کیونکر
وگرنہ آج اُسے ہم نے بھی دیکھا دیکھنے کو

چھپایا ہاتھ سے چہرہ بھی اُس نامہرباں نے
ہم آئے تھے ظفرؔ، جس کا سراپا دیکھنے کو

یہ فیصلہ ہے کہ خود سے خفا نہیں رہنا
وہ مل گیا تو پھر اُس سے جُدا نہیں رہنا

ہنسی خوشی یونہی دن کاٹنا ہیں فرقت کے
اُداس پھرنا نہیں، مُبتلا نہیں رہنا

وہ رات رہنے کو آیا تھا اپنے گھر سے، مگر
جو مَیں نے پُوچھا تو کہنے لگا، نہیں رہنا

وُہی اُمیدِ خرابی ہے طبع سے اپنی
اگرچہ موسمِ دِل ایک سا نہیں رہنا

یہ کیفیت ہے کہ اب کے خبر کسی کو نہیں
کہ کیا بہار میں رہنا ہے، کیا نہیں رہنا

بغیر سانس لیے دن گزارنا ہیں کہ اب
رہے اگر تو رہینِ ہَوا نہیں رہنا

وہ کاروبار کریں گے خدا کے نام پہ ہم
کہ اِس نواح میں نامِ خدا نہیں رہنا

سیہ زباں ہوں مَیں، بچ میری بد دُعا سے کہ تُو
نہیں رہے گا اگر کہہ دیا نہیں رہنا

اُمیدِ وصل غلط بھی نہیں کہ اُس بُت نے
ظفرؔ ہمیشہ تو یُوں بے وفا نہیں رہنا

رُخِ زیبا اِدھر نہیں کرتا
چاہتا ہے ، مگر نہیں کرتا

سوچتا ہے ، مگر سمجھتا نہیں
دیکھتا ہے ، نظر نہیں کرتا

بند ہے اُس کا دَر اگر مُجھ پر
کیوں مجھے در بدر نہیں کرتا

حرفِ انکار اور اتنا طویل
بات کو مختصر نہیں کرتا

نہ کرے، شہر میں وُہ ہے تو سہی
مہربانی اگر نہیں کرتا

حُسن اُس کا اُسی مقام پہ ہے
یہ مسافر سفر نہیں کرتا

جا کے سمجھائیں کیا اُسے، کہ ظفرؔ
تُو بھی تو درگزر نہیں کرتا

مکہ • کہ ، اِنتظار کرنے کو

کرو تو کام پر ـ نے کو

دکھائی دیتی نہیں شکل اب وصولی کی

کہ اُس سے کر تو لیا ہے اُدھار کرنے کو

کہا تھا کس نے یہ تقسیم

کریں گے ہم بھی، مگر، وقت کچھ لگے گا ہمیں

یہ بے حسی کی روش اختیار کرنے کو

خود اُس کے دل سے اُٹھے گی صدا تسلّی کی
بہت کہو نہ اُسے اعتبار کرنے کو

کلیدِ بوسہ کہیں وہ بھی رکھ کے بھول گیا
یہاں بھی دل نہیں ملتا نثار کرنے کو

گناہگار تو پہلے کرو ہمیں اِک بار
ہو بے قرار بہت سنگسار کرنے کو

اُتار پھینکنے کو اب یہی ہے چادرِ چشم
وُہی ہے دامنِ دل تار تار کرنے کو

بساطِ شوق ہی اُس نے لپیٹ دی ہے، ظفرؔ
اُداس ہو جسے لپٹا کے پیار کرنے کو

سیدھا تھا مسئلہ مگر اُلٹا سمجھ لیا
غیروں کا غیر تھا جسے اپنا سمجھ لیا

اب کے ممانعت بھی اجازت لگی مجھے
دیوار تھی کہ جس کو دریچہ سمجھ لیا

اُس کی بھی اُلجھنیں ہیں، مسائل ہیں اُس کے بھی
جلتی تھی آگ، مَیں نے تماشا سمجھ لیا

اپنی بُرائیوں کی خبر تھی مجھے، مگر
اُس نے کہا تو مَیں نے بھی اچھا سمجھ لیا

مَیں ہی سمجھ سکا نہ اُس آئینہ رُو کا بھید
ورنہ اُسے تو جس نے بھی دیکھا، سمجھ لیا

کہتا ہے ، سچ بتائیں ، محبّت ہے یا مذاق
اُس نے مجھے بھی اپنے ہی جیسا سمجھ لیا

ناممکنات میں سے ہے وصل اُس کا، اے ظفرؔ!
حیران ہُوں کہ آپ نے بھی کیا سمجھ لیا

نظر کو چھوڑیے، صرفِ نظر ہی ممکن ہے
قیام کر نہیں سکتے، سفر ہی ممکن ہے

اثر تو خیر بڑی بات ہے، کہ اُس بُت پر
بہت کرو تو گُمانِ اثر ہی ممکن ہے

ہم ایک بار جو قائل نہ کر سکے اُس کو
تو اِس لیے کہ یہ بارِ دگر ہی ممکن ہے

نہ اور اُونچی صدا میں پُکارنا اُس کو
کہ آج کل تو فقط اِس قدر ہی ممکن ہے

جسے سمجھتے رہے ایک عُمر ناممکن
پتا چلا ہے کہ وہ سر بسر ہی ممکن ہے

بتا بھی سکتا ہُوں کب تک بُھلا سکوں گا اُسے
مگر، یہ بات اُسے دیکھ کر ہی ممکن ہے

وہ مہرباں ہے تو ہل لو جہاں بھی ہو ممکن
کہ اب کے گھر تو نہیں، رہگزر ہی ممکن ہے

فضُول طُولِ ملاقات پر نہ کر اصرار
کہ چل چلاؤ ہے اور مختصر ہی ممکن ہے

ہُنر وَری تو بہت دُور کی ہے بات، ظفرؔ
ابھی تو کوششِ خوابِ ہُنر ہی ممکن ہے

نکل سکوں قفسِ اعتبار سے باہر
نہیں ہے یہ بھی مرے اختیار سے باہر

برونِ خاک نہیں میرے نام کی تحریر
نشاں نہیں مرا عکسِ غبار سے باہر

حساب اُس کا ہے درپیش، حد نہیں جس کی
شمار اُس کا ہے جو ہے شمار سے باہر

کسر نکالتا ہے خوب گھر پہنچتے ہی
مجھے کہ رکھتا ہے وہ اتنے پیار سے باہر

کسی نے رُخ نہ کیا اُس کے بعد جنگل کا
نہ شیر ہی کبھی نکلا کچھار سے باہر

اُمیدوارِ کرم ہم بھی تھے وہاں اب کے
مگر، کھڑے رہے شاید قطار سے باہر

بس ایک حسرتِ ہمخوابِ دِل میں تھی، وہ بھی
نکل چلی ہے لہُو کے مدار سے باہر

مَیں ایک عمر سے کوشش میں ہُوں نکلنے کی
طلسمِ دائرۂ انتظار سے باہر

دِکھا ہمیں کبھی اُس کا بھی اصل چہرہ ظفرؔ
نکال اُسے بھی ہوس کے حصار سے باہر

یُوں بھی نہیں کہ میرے بُلانے سے آگیا
جب رہ نہیں سکا تو بہانے سے آگیا

ہم کر کے بات پھنس گئے اپنے ہی جال میں
کیسا پلٹ کے تیر نشانے سے آگیا

وُہ مرحلہ کہ ڈرتے رہے جس سے ایک عُمر
خوابوں کے ساتھ خواب بِلانے سے آگیا

آتا نہ تھا کبھی ہمیں اپنا خیال کچُھ
اِتنا بھی اُس کے پاس بٹھانے سے آگیا

کیا لاتعلقی سے ہُوا فائدہ ہمیں
کیا اُس کے ہاتھ بات بڑھانے سے آگیا

اب جو سلوک بھی وہ کرے ہے روا اُسے
کیوں مَیں ہی اُٹھ کے اپنے ٹھکانے سے آگیا

کچُھ اَور بھی سنپولیے حق دار تھے، ظفرؔ
مَیں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آگیا

سرکش سہی، فی الحال تو سر بھی نہیں رکھتے
کیا اہلِ نظر ہیں کہ نظر بھی نہیں رکھتے

کرتے ہیں گلہ بھی کہ ثمر ہی نہیں آتا
کچھ رابطۂ شاخ و شجر بھی نہیں رکھتے

اک لرزشِ بے نام ہے پہلو میں گرہ گیر
ظاہر میں کوئی خوف و خطر بھی نہیں رکھتے

دُنیا سے بھی محتاط ہیں اور دل سے بھی مجبور
روتے بھی ہیں اور دیدۂ تر بھی نہیں رکھتے

کچھ تو ترے جانے کا یقیں بھی نہیں ہم کو
کچھ ہم ترے آنے کی خبر بھی نہیں رکھتے

یہ نالۂ دِل ہے کہ اثر ہی نہیں کرتا
کر جائے تو ہم تابِ اثر بھی نہیں رکھتے

کافی ہے یہاں ایک اشارہ ہی سفر کا
کہتے ہو تو ہم رختِ سفر بھی نہیں رکھتے

جس دن سے اُدھر جانے سے روکا ہے ذرا سا
اُس دن سے قدم آپ اِدھر بھی نہیں رکھتے

شرمندہ بہت ہیں ظفرؔ اِس عیبِ سخن پر
اور، اِس کے سوا کوئی ہُنر بھی نہیں رکھتے

عجیب سلسلۂ روزگار رکھتے ہیں
کہ معتبر نہیں، اور، اعتبار رکھتے ہیں

ہمیں ہے عشرتِ آغازِ خواب ہی کافی
اگرچہ خواہشِ پایانِ کار رکھتے ہیں

کچھ اُس کے لُطف و کرم کا حساب ہے کوئی
نہ اپنی حسرتِ دل کا شمار رکھتے ہیں

اگر شہیدِ ہوس ہیں تو اس قماش کے ہم
کہ جس پہ مرتے ہیں اُس کو بھی مار رکھتے ہیں

وہ سامنے ہو تو بے اختیار ہو جائے
ہم اپنے دل پہ یہی اختیار رکھتے ہیں

یہاں پہ تھا تو یہ ضد تھی کہ وُہ چلا ہی جائے
چلا گیا ہے تو اب اِنتظار رکھتے ہیں

اُسے ہی آب و ہَوا راس ہے محبّت کی
نہ ہم ہی موسمِ دل خوشگوار رکھتے ہیں

نجانے ختم بھی ہو گی کہیں یہ بارشِ خاک
نظر میں گرد ہے، دِل میں غُبار رکھتے ہیں

چراغِ چہرہ کو بُجھنے نہیں دیا، کہ ظفرؔ
ہم اپنے گِرد ہَوا کا حِصار رکھتے ہیں

چُھپا ہُوا ہی سہی خوفِ خواب کے پیچھے
نکل پڑوں گا کبھی آفتاب کے پیچھے

بدن میں خاک اُڑاتی ہیں آندھیاں کیا کیا
جو دیکھ لو کبھی اِس آب و تاب کے پیچھے

ہے وُہ بھی زہر، مگر ذائقہ تو بدلے گا
بہت سکُوں نہ سہی اضطراب کے پیچھے

دبا رکھی ہے وہ تحریرِ خواب دل میں کہیں
چُھپا رکھا ہے وہ منظر کتاب کے پیچھے

لہُو کی لہر تھی یا سوچ کی کوئی سلوٹ
لرز رہی تھی کوئی شَے شراب کے پیچھے

جئیں گے کشمکشِ زندگی میں کیا آخر
مَرے جو پھرتے ہیں خط کے جواب کے پیچھے

عجب نہیں ہے اگر مار ہی گرائیں اُسے
جو فاختائیں لگی ہیں عُقاب کے پیچھے

بُھلا رکھا نہیں یُونْہی خُدا کی دُنیا کو
پڑے ہُوئے نہیں یُونْہی جناب کے پیچھے

ظفرؔ، جو ہو نہیں سکتا اُسی کے درپے ہو
فضول بھاگ رہے ہو سراب کے پیچھے

جسے بھی اُس پہ ہے دعوائے جبر، بکتا ہے
ہُوا ہے وُہ تو ، اُسے کون روک سکتا ہے

بس ایک بار پڑا تھا اُس آفتاب کا عکس
یہ دِل ، یہ سنگِ سیہ رات بھر چمکتا ہے

یہ اِتّفاق نہیں ہے جو رنگِ زرد اُس کا
کبھی کبھی مِرے چہرے سے بھی جھلکتا ہے

کہیں چھُپائے بھی چھُپتی نہیں خوشی اُس کی
غم اُس کی گود میں بچّہ سا جب ہُمکتا ہے

نہیں ہے صبر کی گنجائش اِس قدر دِل میں
مگر، ابھی یہ پیالہ کہاں چھلکتا ہے

مَیں قتل ہو کے بھی خوشبُو بکھیرتا ہُوں ظفرؔ
لہُو گلُاب کی صورت پڑا مہکتا ہے

نظر کا پھیر ہے یا مال ہی کچھ ایسا تھا
کہ ہم تو بھول گئے چال ہی، کچھ ایسا تھا

کوئی بچاؤ کی صورت نہ تھی کہیں باقی
بُرے پھنسے ہیں، کہ وہ جال ہی کچھ ایسا تھا

تمام شہر سلامت ہے میرے گھر کے سوا
یقین کیجیے، بھونچال ہی کچھ ایسا تھا

کچھ اپنے آپ پہ قابو بھی چاہیے، اے دل
لبوں کا رنگ اگر لال ہی کچھ ایسا تھا

یونہی تو پُوچھتا پھرتا نہیں تھا لوگوں سے
کہ اُن دِنوں میں مرا حال ہی کچُھ ایسا تھا

مَیں خود بھی اُس سے نکلنا نہ چاہتا تھا ابھی
نہ پوچھیے، کہ وہ جنجال ہی کچُھ ایسا تھا

جو ظُلم اُس نے کیے، اُن کا ذکر کیا کیجے
ہماری عُمر میں یہ سال ہی کچُھ ایسا تھا

اُسے ہماری محبّت پہ شک بجا تھا، ظفرؔ
ہمارا نامۂ اعمال ہی کچُھ ایسا تھا

منظر، ظفرؔ کھُلیں ہی کھُلیں آفتاب کے
اُڑنے لگے ہَوا میں کنارے نقاب کے

ہونٹوں سے چھُو بھی لے، مگر آنکھوں کو بند رکھ
طُغیانیوں میں ہیں یہ سمندر سراب کے

کالج سے اُس کو کام بہت تھا، بلا ہُوا
مَیں نے بھی کچھ سوال نکالے حساب کے

کچھ بھر دیا ہے خواہشِ خالی میں رنگِ دل
کچھ پُر کیے ہیں بیٹھ کے نقشے نصاب کے

نشہ تھا ٹُنڈ مُنڈ درختوں کے آر پار
تھے اُس کے شارٹ کوٹ پہ چھینٹے شراب کے

بتّی بُجھی تو گدلے اندھیرے میں اور بھی
چمکے حروفِ گرم و گُداز اُس کتاب کے

اِس شوقِ بے مُہار کا انجام ہو بخیر
اَچھّے نہیں لہُو میں بھنور ماہتاب کے

اُلجھی ہوئی ہیں سر میں صداؤں کی گُچھّیاں
یا پاؤں میں کُھبے ہُوئے ٹکڑے ہیں خواب کے

آنکھوں میں سُرخیوں کا سفر رُک گیا، ظفر
دیکھا تو ہم اسیر تھے نیلے گلاب کے

پتّوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے
شہرِ شبِ خزاں سے گزرنا تو چاہیے

ڈوبے ہوؤں کو طرّۂ طوفاں نے یہ کہا
سیلِ سفر کے ساتھ اُبھرنا تو چاہیے

کچھ زندگی کا ذائقہ بدلے کسی طرح
یعنی کسی کے نام پہ مَرنا تو چاہیے

لے ہی مَریں گے کچھ نہ کچھ، اپنا زیاں ہے کیا
کچھ روز دَر پہ اُس کے پسَرنا تو چاہیے

ہو جس کے گھر بھی چور ہمارا چھپا ہُوا
الزام سارے شہر پہ دھرنا تو چاہیے

آنکھوں میں رنگ تیرگیٔ آبِ سبز ہو
آخر وہ نقشِ ناب نکھرنا تو چاہیے

ساحل سے مَوج مَوجِ بدن کا شُمار کیا
اُس بحرِ بے صدا میں اُترنا تو چاہیے

ہو گا وُہی جو دِل نے کہا بابِ وصل میں
ڈرنے کی بات اَور ہے، ڈرنا تو چاہیے

پکڑے گئے تو وُہ بھی بُھگت لیں گے، اے ظفرؔ
فی الحال اُس کے آگے مُکرنا تو چاہیے

کھولیے آنکھ تو منظر ہے نیا اور بہت
تُو بھی کیا کُچھ ہے، مگر تیرے سوا اور بہت

جو خطا کی ہے، جزا خُوب ہی پائی اُس کی
جو ابھی کی ہی نہیں، اُس کی سزا اور بہت

خوب دیوار دکھائی ہے یہ مجبُوری کی
یہی کافی ہے، بہانے نہ بنا اور بہت

دیکھ، رہ جائے نہ حسرت کوئی دل میں تیرے
شور کر اور بہت، خاک اُڑا اور بہت

ہم چلے جائیں تو کیا فرق پڑے گا تجھ کو
شہر بستا ہے، گلیوں میں گدا اور بہت

سر سلامت ہے تو سجدہ بھی کہیں کر لیں گے
جستجو چاہیے، بندوں کو خدا اور بہت

کیوں پشیمان پھرو ترکِ حیا پر اتنے
اور بازار سے لے آؤ، حیا اور بہت

عشق وہ طُرفہ لطیفہ رہا اس بار، کہ میں
اُس نے دوبارہ سُنایا تو ہنسا اور بہت

سر میں جھگڑ جو چلا کرتا ہے دن رات، ظفرؔ
یہ گرائے گا ابھی برگِ نوا اور بہت

کشتی ہوس ہواؤں کے رُخ پر اُتار دے
کھوئے ہوؤں سے مل، یہ دلدر اُتار دے

بے سمت کی اُڑان ہے شوخی شباب کی
اس چھت پہ آج تو یہ کبوتر اُتار دے

مَیں اتنا بد معاش نہیں، یعنی کھُل کے بیٹھ
چُبھنے لگی ہے دھوپ، سویٹر اُتار دے

دن رات یُوں نہ خوف کا گٹھڑ اُٹھائے پھر
یہ بوجھ اپنے سر سے جھٹک کر اُتار دے

اس کی ہی آب و تاب سے روشن ہو ریگِ دِل
یہ تیغ میرے سینے کے اندر اُتار دے

چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدُورتیں
دیوار سے پُرانا کیلنڈر اُتار دے

یہ بات ظرف کی نہیں، ہے ماورائے ظرف
چاہے تو اِس کنُوئیں میں سمندر اُتار دے

لوگوں کے ساتھ میری لڑائی ہے آج کل
بہتر ہے مُجھ کو شہر سے باہر اُتار دے

تُو خود تو سات پردوں میں مستور ہے، ظفرؔ
ملبوس تیرے آگے وُہ کیونکر اُتار دے

جو تھے امیر اب اُن کو فقیر تو دیکھو
رہا کیے ہُوئے اپنے اسیر تو دیکھو

ہمارا ایک نظر دیکھنا بھی تھا معیُوب
اور ، اب یہ سلسلۂ دار و گیر تو دیکھو

وہ ظرف تھا کہ لُٹے ابتدائے عشق میں ہم
ٹھہر تو جاؤ ، ہمارا اخیر تو دیکھو

ہم اُس سے کچُھ بھی نہیں چاہتے، وہ ہے تو سہی
ہماری خاکِ طلب کا خمیر تو دیکھو

ہنسی مذاق تو ظاہر کا رنگ ہے اُس کا
جو اُس کے دِل میں ترازُو ہے تیر تو دیکھو

ظفرؔ، غلط ہے کہ مَیں اُس کو پا نہیں سکتا
یہ میرے ہاتھ پہ اُس کی لکیر تو دیکھو

سو بھی تمام گرمیٔ بازار کا بدن
یاقوتِ لب پہ گوہرِ گفتار کا بدن

ہر شام دائرے سے بناتا ہے میرے گِرد
اُس جسمِ جاں گداز کے اسرار کا بدن

چمکے گا پھر ہوائے بیاباں کی رات میں
ریگِ ہوس پہ وعدۂ دیدار کا بدن

دِل میں گھلا ہے ٹوٹتی راتوں کا زہرِ زرد
پگھلا ہے سر میں صُبح کے آثار کا بدن

پھیلے ہوئے ہیں کائی زدہ لفظ ہر طرف
ہے درمیاں میں حسرتِ اظہار کا بدن

پھرتا ہے گردباد کی صورت کہاں کہاں
دل کی فضا میں خاکِ خبردار کا بدن

آغازِ شیشہ رنگ، تمنّا کی ابتری
پانی کا پھول، عکسِ گرفتار کا بدن

دریا تو اپنا آپ ہے، کیسے عبور ہو
بے شک پکارتا رہے اُس پار کا بدن

مخفی ہے اُس کی رمز بدن در بدن ظفرؔ
اِنکار کے بدن میں ہے اقرار کا بدن

دیکھتے دیکھتے ویراں ہُوئے منظر کتنے
اُڑ گئے بامِ تمنّا سے کبوتر کتنے

ہم ذرا صبر جو کرتے تو وہ خود کہہ دیتا
بن گئے کہہ کے وہی بات سبک سر کتنے

لڑکیاں سُنتی نہیں، دیکھتی رہتی ہیں اُسے
روز بیکار چلے جاتے ہیں لیکچر کتنے

کوئی مطلب ہے محبت کا نہ مقصد ہے کوئی
ذائقے ہیں، مگر اِس زہر کے اندر کتنے

اُس سے مانگا نہ کبھی خُونِ تماشا کا حساب
اُس سے پُوچھا نہ کبھی ہیں ترے پیکر کتنے

ایک اُمید کہ جھُوٹی ہی سہی ، پر دیکھو
اِسی اُمّید سے روشن ہیں یہاں گھر کتنے

کیوں نہ جھگڑا ہو یہاں عُرسِ غزل پر ہر بار
قبر ہے ایک ظفرؔ ، اور مجاور کتنے

ایسا نہیں کہ دادِ ہُنر دیجیے مجُھے
اِک بار شرمسار تو کر دیجیے مجھے

میری تو خامیاں ہُوئیں سب آشکار، اب
اپنی بھی خوبیوں کی خبر دیجیے مجھے

در پیش ہے، مسافتِ موہوم ہی سہی
کچُھ آپ بھی تو زادِ سفر دیجیے مجھے

تعریف کو طلب ہی سمجھ لیجیے، مگر
طعنہ تو یہ نہ شام و سحَر دیجیے مجھے

بدنام ہوں، بُرا ہوں، غلط ہوں، غریب ہوں
موقع تو ایک بار، مگر دیجیے مجھے

بے فائدہ ہے جال بچھانا یہاں، ظفرؔ
اچھا ہی مشورہ ہے اگر دیجیے مجھے

لرزشِ پردۂ اظہار کا مطلب کیا ہے

ہے یہ دیوار تو دیوار کا مطلب کیا ہے

جس کا انکار ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہُوں

جانتا ہی نہیں انکار کا مطلب کیا ہے

ایک بار اُس نے اگر دے ہی دِیا صاف جواب

پھر اُسی بات پہ اِصرار کا مطلب کیا ہے

بیچنا کچُھ نہیں اُس نے تو خریدار ہیں کیوں

آخر اس گرمیٔ بازار کا مطلب کیا ہے

اُس کی راہوں میں بکھر جائے یہ خاکسترِ چشم
اور اپنے لیے دیدار کا مطلب کیا ہے

ربط باقی نہیں الفاظ و معانی میں، ظفرؔ
کیا کہیں اُس سے کہ اِس پیار کا مطلب کیا ہے

اب تو یہ انتظام رکھنا ہے
کام سے اپنے کام رکھنا ہے

نشّہ اُن خواب خواب آنکھوں کا
اپنے اُوپر حرام رکھنا ہے

وہ بھی ہیں رکھ رکھاؤ کے قائل
ہم کو بھی احترام رکھنا ہے

اُس کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے
طبع کو ہم نے خام رکھنا ہے

اُس کا مقصد اسیر کرنا نہیں
اِک ذرا زیرِ دام رکھنا ہے

اُس نے پیدا کیا سوال، ظفرؔ!
مَیں نے اب اُس کا نام رکھنا ہے

بستی میں ہے پانی تو نگر میں بھی ہے پانی
جَل تھَل نہیں بازار ہی، گھر میں بھی ہے پانی

یہ چھت ہے کہ چھلنی ہے کوئی ، اِس کے علاوہ
دیوار میں مرتا ہے تو دَر میں بھی ہے پانی

سامان تو بِھیگا ہے کہ بچپتا نہ کِسی طَور
ساماں کے، مگر، زیر و زبر میں بھی ہے پانی

وُہ ٹُوٹ کے برسا ہے، بہالے گیا ہر شَے
پانی میں ضرر ہے تو ضرر میں بھی ہے پانی

کھاتہ بھی ہے لبریز، کھتونی بھی لبالب
میدان میں بھی، راہگزر میں بھی ہے پانی

پہنچے کوئی کیا، پاؤں کی زنجیر ہے بارش
دیکھے کوئی کیا، ظرفِ نظر میں بھی ہے پانی

اُس حُسن کی آنکھوں کے اُفق پر بھی ہیں بادل
اُس زُلف کے پیچیدہ بھنوَر میں بھی ہے پانی

کِس طرح خیالات شرابور نہ ہوتے
سوچو تو یہاں کاسۂ سر میں بھی ہے پانی

چُپ رہیے تو بس ڈُوبتے ہی جائیے ہر دَم
کہیے تو ظفؔر عرضِ ہُنر میں بھی ہے پانی

گھونسلے، شاخیں، ثمر، سارا شجر پانی میں ہے
کیا وضاحت ہو کہ کیا کچھ سر بسر پانی میں ہے

سر پہ تھا ساماں کہ پھر بارش نے آگھیرا ہمیں
جو نکالا تھا ابھی ، بارِ دِگر پانی میں ہے

طعنے دیتا تھا کبھی خانہ بدوشی کے ہمیں
آج اُس بے مہر کا اپنا بھی گھر پانی میں ہے

ہر کوئی باراں گزیدہ ہے، جہاں بھی، جو بھی ہو
یہ اِدھر بوچھاڑ میں ہے، وُہ اُدھر پانی میں ہے

جو جہاں موجود ہے اُس کو غنیمت جان لو
جو کہیں گُم ہو گیا اُس کی خبر پانی میں ہے

ایک ہی صف میں ہیں، کس کا ہو بیاں، کس کا نہ ہو
معتبر پانی میں ہے، نامعتبر پانی میں ہے

اور کیا مذکور ہو، اتنا سمجھ لیجے، اگر
زندگی ہے اِک سفر، رختِ سفر پانی میں ہے

اُس کا ہی کچھ بچ رہا ہو ڈوبنے سے، دیکھنا
کیا کہیں، اپنا تو سب عیب و ہُنر پانی میں ہے

آزمالے وہ ہمارے حوصلے بے شک، ظفرؔ
دیکھنا ہے، آپ بھی وہ کس قدر پانی میں ہے

یہ فردِ جُرم ہے مُجھ پر کہ اُس سے پیار کرتا ہُوں
مَیں اِس الزام سے فی الحال تو اِنکار کرتا ہُوں

جھٹک دیتا ہے خوابِ وصل کا ہر رنگ آنکھوں سے
یہ کوشش، کیا کہوں، ہر روز کِتنی بار کرتا ہُوں

سُلا دیتا ہُوں دل میں تھپکیاں دے کر محبّت کو
اور، اُس کی جگہ فرضی نفرتیں بیدار کرتا ہُوں

سبھی حیران ہیں کیا تھا وہ سمجھوتہ جُدائی کا
نہ وُہ اعلان کرتا ہے نہ میں اظہار کرتا ہُوں

عجب کیا ہے اگر گھاٹا پڑا مُجھ کو محبّت میں
یہ کاروبار ہے، اور، مَیں یہ کاروبار کرتا ہُوں

ہمیں بھی مطلب و معنی کی جُستجو ہے بہت
حریفِ حرف، مگر، اب کے دُو بدُو ہے بہت

پھٹے پُرانے دِلوں کی خبر نہیں لیتا
اگرچہ جانتا ہے، حاجتِ رفُو ہے بہت

بدن کا سارا لہُو کھنچ کے آگیا رُخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سُرخرُو ہے بہت

اِدھر اُدھر یُونہی مُنہ مارتے بھی ہیں، لیکن
یہ مانتے بھی ہیں دِل سے کہ ہم کو تُو ہے بہت

اب اُس کی دید محبّت نہیں، ضرورت ہے
کہ اُس سے مل کے بچھڑنے کی آرزو ہے بہت

یہی ہے بے سروپا بات کہنے کا موقع
سُننے کا کون یہاں، شور چار سُو ہے بہت

یہ حال ہے تو بدن کو بچائیے کیونکر
صدا میں دُھوپ بہت ہے، لہو میں لُو ہے بہت

یہی ہے فکر، کہیں مان ہی نہ جائیں، ظفرؔ
ہمارے معجزۂ فن پہ گفتگو ہے بہت

بندھے وہ زورِ ظفرؔ خاک کی روانی کے
کہ رنگ بُجھنے لگے خُون کی نشانی کے

کُھلے بدن کی زباں سے کبھی پُکار اُس کو
اُٹھا مزے بھی کبھی اپنی بے زبانی کے

اُلجھ نہیں، رَوِش و رنگ کا تماشا کر
جدھر سے آئے، سبھی راستے ہیں پانی کے

پھر آئی تھی وہی لفظوں کی تُند و تیز ہَوا
اُڑا کے لے گئی ذرّے زرِ معانی کے

فلک پہ چاند بنی آمدِ خزاں کی خبر
زمیں کا رزق ہُوئے راز گُل بیانی کے

لبوں پہ ذائقہ ہے مرگِ شہد منزل کا
رگوں میں دَوڑتے ہیں زہر زندگانی کے

لرز گیا ہے کوئی شاخ شاخ جسم ظفرؔ
چمک اُٹھے ہیں کہیں نقش نوجوانی کے

ہوتا رہے گا یُوں ہی نظارا کہ اب نہیں
پہلے ہی کب تھا اپنا گزارا کہ اب نہیں

چھوڑا ہے جب سے اُس نے وُہ اندازِ التفات
ہم نے بھی کر لیا ہے کنارا کہ اب نہیں

وُہ چاند پھر چڑھے گا کبھی، پوچھتا ہے دِل
کہتا ہے شامِ ہجر کا تارا کہ اب نہیں

دھڑکے گا جب تک اُس کی اجازت رہی یہ دِل
رُک جائے گا جب اُس نے پُکارا کہ اب نہیں

راضی رہیں گے اُس کی رضا پر اِسی طرح
کہنا پڑے نہ اُس کو دوبارا کہ اب نہیں

ہم اتنے عقلمند نہ ہوں گے، مگر ظفرؔ
کافی تھا اُس کا ایک اشارہ کہ اب نہیں

وُہ کوئی خوابِ پریشاں تھا، محبّت کیا تھی
یاد بھی اب تو نہیں ہے، مری حسرت کیا تھی

میری آشفتہ سری کا بھی نہ تھا کوئی جواز
غمزدہ رہنے کی اُس کو بھی ضرورت کیا تھی

مُسکرا دینے پہ اُس کا تو کبھی کچُھ نہ لگا
دیکھ لو، ہم نے ادا کی ہے جو قیمت، کیا تھی

اُس کی تردید بہر حال بجا تھی، ورنہ
سبھی معلوم ہے اُس کو بھی، حقیقت کیا تھی

اب کہیں تمغۂ رُسوائی ملا اُس کے طفیل
شہر میں ورنہ ظفرؔ آپ کی عزّت کیا تھی

کچھ ہم میں پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا
ظالم تو وہ تھا ہی، مگر اتنا بھی نہیں تھا

جب گھر سے چلے تھے تو یہ حالت تھی ہماری
دامن میں کوئی تارِ تمنّا بھی نہیں تھا

حاصل تھیں اُسے جملہ تفاصیل ہماری
جب ہم نے اُسے غور سے دیکھا بھی نہیں تھا

بے بس تھا تو دعوے ہی نہ وہ باندھتا اتنے
اب اس پہ مُصر ہے کہ وُہ دھوکا بھی نہیں تھا

آگے نہیں بڑھنا ہے تو واپس ہی پلٹ جائے
یہ عشق نہیں تھا تو تماشا بھی نہیں تھا

مَیں زرد آگ نہ پانی کے سرد ڈر میں رہا

رہا تو سوئی ہوئی خاک کے خطر میں رہا

وہ گرد باد کہ دِل کی زباں کا ذائقہ ہے

نظر اُفق پہ ہویدا ہُوا نہ سَر میں رہا

کہ شامل اُس میں مری لرزشِ خیال بھی تھی

جو اصل چھوڑ کے مَیں عکس کے اثر میں رہا

ترے لباس پہ ہو اُس کی واپسی کی چمک

جو ایک عمر ترے خُون کے سفر میں رہا

گھِرا تھا چاروں طرف دُھوڑ کی قنات سا مَیں
مگن زمانہ کِسی نقشِ تر بتر میں رہا

اُس ایک لمحے کی گُم گشتگی پہ خوش ہیں سبھی
جو حشر بن کے مِرے سنگِ بے شرر میں رہا

یہ شہر زندہ ہے، لیکن ہر ایک لفظ کی لاش
جہاں کہیں سے اُٹھی، شور میرے گھر میں رہا

چپاتیاں تھیں بندھی پیٹ پر، مگر شب بھر
اُبھرتا ڈُوبتا مَیں بھُوک کے بھنور میں رہا

کہاں سے، کیسے، کِسے، کون لے اُڑا تھا ظفرؔ
جو آدھی رات کو رُولا سا دشت و دَر میں رہا

مِلوں اُس سے تو مِلنے کی نشانی مانگ لیتا ہُوں
تکلّف بر طرف، پیاسا ہُوں، پانی مانگ لیتا ہُوں

سوالِ وصل کرتا ہُوں کہ چمکاؤں لہُو دِل کا
مَیں اپنا رنگ بھرنے کو کہانی مانگ لیتا ہُوں

یہ کیا اہلِ ہوس کی طرح ہر شے مانگتے رہنا
کہ مَیں تو صِرف اس کی مہربانی مانگ لیتا ہُوں

وُہ سیرِ صُبح کے عالم میں ہوتا ہے تو مَیں اُس سے
گھڑی بھر کے لیے خوابِ جوانی مانگ لیتا ہُوں

جہاں رُکنے لگے میرے دلِ بیمار کی دھڑکن
مَیں اُن قدموں سے تھوڑی سی روانی مانگ لیتا ہُوں

ہرا معیار میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
نئے لمحوں میں تصویریں پُرانی مانگ لیتا ہُوں

زیاں کاری ظفرؔ بُنیاد ہے میری تجارت کی
سُبک ساری کے بدلے سرگرانی مانگ لیتا ہُوں

درونِ خانہ کہ بیرونِ در ضرورت ہو
بریدہ دستِ طلب ہیں جدھر ضرورت ہو

چلو، تمھیں تو ضرورت نہ تھی محبت کی
ہمی سے پوچھتے، شاید اِدھر ضرورت ہو

دکھائی دیتے رہو ایک بار تو دن میں
اگرچہ تم مری شام و سحر ضرورت ہو

چھپائے پھرتا ہوں خود کو تمھاری خواہش پر
میں ہو بھی سکتا ہوں ظاہر اگر ضرورت ہو

یہ دِل کی غیر ضروری ضرورتیں، یعنی
تم آؤ بھی نہیں، اور سر بسر ضرورت ہو

مِلے کہیں تو ظفرؔ سے یہ پُوچھ لینا خود
سوال کرتا نہیں، کیا خبر ضرورت ہو

کھڑکیاں کس طرح کی ہیں، اور، دَر کیسا ہے وُہ
سوچتا ہُوں، جس میں وُہ رہتا ہے، گھر کیسا ہے وُہ

کیسی وہ آب و ہوا ہے جس میں وہ لیتا ہے سانس
آتا جاتا ہے وہ جس پر رہگزر کیسا ہے وُہ

کونسی رنگت کے ہیں اُس کے زمین و آسماں
چھاؤں ہے جس کی یہاں تک بھی، شجر کیسا ہے وُہ

اِک نظر میں ہی نظر آجائے گا وہ سر بسر
پھر بھی اُس کو دیکھنا، بارِ دِگر کیسا ہے وُہ

مَیں تو اُس کے ایک اِک لمحے کا رکھتا ہوں شُمار
اَور، میرے حالِ دل سے بے خبر کیسا ہے وُہ

اُس کا ہونا ہی بہت ہے، وہ کہیں ہے تو سہی
کیا سرو کار اُس سے ہے مُجھ کو، ظفرؔ، کیسا ہے وُہ

کب وُہ ظاہر ہو گا اور حیران کر دے گا مجھے
جتنی بھی مشکل میں ہُوں آسان کر دے گا مجھے

رُوبرُو کر کے کبھی اپنے مہکتے سُرخ ہونٹ
ایک دو پل کے لیے گلدان کر دے گا مجھے

رُوح پھُونکے گا محبّت کی مرے پیکر میں وُہ
پھر وُہ اپنے سامنے بے جان کر دے گا مجھے

خواہشوں کا خُوں بہائے گا سرِ بازارِ شوق
اور، مکمّل بے سروسامان کر دے گا مجھے

منہدم کر دے گا آ کر ساری تعمیراتِ دِل
دیکھتے ہی دیکھتے ویران کر دے گا مجھے

ایک ناموجودگی رہ جائے گی چاروں طرف
رفتہ رفتہ اس قدر سُنسان کر دے گا مجھے

یا تو مُجھ سے وہ چُھڑا دے گا غزل گوئی، ظفرؔ
یا کسی دِن صاحبِ دیوان کر دے گا مجھے

بہت کچھ ہو تو سکتا ہے، مگر، کچھ بھی نہیں ہو گا
مجھے معلوم ہے اُس پر اثر کچھ بھی نہیں ہو گا

مسافت میں کسی لاحاصلی کا رنگ ہے شامل
کہ یُوں لگتا ہے، انجامِ سفر کچھ بھی نہیں ہو گا

رُتوں پر جیسے چھا جائے گا اُس کے ہجر کا موسم
شجر ہوں گے، مگر، اب کے ثمر کچھ بھی نہیں ہو گا

کشاکش دل کے اندر ہے کہیں، اور، جس قدر بھی ہے
یہیں رہ جائے گی، بیرونِ در کچھ بھی نہیں ہو گا

ہٹاتا کیوں نہیں چہرے سے یہ اسرار کی چادر
بتاتا کیوں نہیں مجھ کو اگر کچھ بھی نہیں ہو گا

مَیں دیکھوں گا اُسے، اور، دیکھتا رہ جاؤں گا یکسر
نظر ہوگی نہ اندازِ نظر، کچھ بھی نہیں ہو گا

وہ آنکھوں کا اندھیرا ہو کہ ہونٹوں کا اُجالا ہو
مجھے اندازۂ شام و سحر کچھ بھی نہیں ہو گا

محبّت، اور، محبّت کرنے والے کم نہیں، لیکن
اُدھر ہی جائے گا یہ دِل جدھر کچھ بھی نہیں ہو گا

ظفرؔ، کرنا پڑے گا اُس کو پہلی بار ہی قائل
نہ ہو پایا تو پھر بارِ دِگر کچھ بھی نہیں ہو گا

سرِ شاخسار گلاب ہے کہ سراب ہے
مرے سامنے یہ کتاب ہے کہ سراب ہے

کوئی پیاس ہے مری خواہشوں میں رُکی ہُوئی
کہیں دُور چشمۂ آب ہے کہ سراب ہے

یہ طلسمِ خوابِ وصال ہے کہ ہے واہمہ
یہ لہُو میں زورِ شباب ہے کہ سراب ہے

وُہی ناشناس ہُوں اُس کے نیم سخن کا مَیں
کہ سوال ہے کہ جواب ہے کہ سراب ہے

کسی لب پہ حرفِ حجاب ہے کہ فسوں کوئی
کسی رُخ پہ نازِ نقاب ہے کہ سراب ہے

تری اُنگلیوں کا شمار ہے مرے رُو برُو
کہ یہ حُسن ہے کہ حساب ہے کہ سراب ہے

مجھے کیا خبر کہ یہ اتنے دُور کی دوستی
کوئی رنج خانہ خراب ہے کہ سراب ہے

وُہی خستگی کا خُمار ہے مرے چار سُو
ترے وسط میں مرا خواب ہے کہ سراب ہے

وُہ ہمارا نقشِ نیاز تھا کہ نہیں ظفرؔ
یہ کسی کا عکسِ عتاب ہے کہ سراب ہے

رفتہ رفتہ اِس دِل سے جو محبت ماند پڑی
یُوں محسوس ہُوا ہر ایک ضرورت ماند پڑی

دھاروں دھار برسنے والا بادل خُشک ہُوا
خوابوں خواب چمکنے والی صورت ماند پڑی

آہستہ آہستہ سارے منظر دُھول ہُوئے
آنکھوں میں اِک نَو تعمیر عمارت ماند پڑی

پہلے تو اُتری اُس نغمہ نواز آواز کی آب
پھر اُس شوخ کے تازہ خط کی عبارت ماند پڑی

رات میں دن سا کر دیتا تھا یاد کا روشن لمس
پھر وہ موسم بدلا، اور، وہ مہلت ماند پڑی

تنگ پڑے جب آخر اپنے جوشِ جنوں سے ہم
جنگل سے واپس گھر آئے، وحشت ماند پڑی

شُکر کرو، اِن آنکھوں کا وہ خوف تمام ہُوا
اور، ظفرؔ، اِس خالی دل کی دہشت ماند پڑی

حُسن کے انکار سے بھی کچھ تو پردہ رہ گیا
مَیں بھی کافی مطمئن ہُوں، وُہ بھی اچھّا رہ گیا

دل میں اُس کے موم بتّی سی جلائی بھی، مگر
روشنی کے باوجود اِتنا اندھیرا رہ گیا

کیا کِیا جائے کہ سمجھوتہ یہی تھا اُس کے ساتھ
اُس کا خط واپس کِیا اُس کو، لفافہ رہ گیا

خُوبصورت ہے تو اُتنا ہی کمینہ بھی ہے وُہ
ایک بھی دل نے نہ مانی، مَیں تو کہتا رہ گیا

دیکھنے آتا بھی ہے چھوڑے ہُوئے اِس شہر کو
یعنی اُس کے بعد کیا اُجڑا ہے، کِتنا رہ گیا

موڑ کر دریا کو دُشمن لے گئے اپنی طرف
اور، اِدھر رُوئے زمیں پر داغِ دریا رہ گیا

اَور گھر دیکھو کوئی، اُس کے تو چہرے پر، ظفرؔ
رنگِ دِل باقی نہیں اب، رنگِ دُنیا رہ گیا

جُرمِ دل کی سزا نہیں دیتا
کیوں کوئی فیصلہ نہیں دیتا

خوابِ حسرت ہوں، دیکھتا نہیں وُہ
خاکِ دِل ہُوں، اُڑا نہیں دیتا

اِس قدر احتیاط ہے اُس میں
ڈھونڈتا ہے، صدا نہیں دیتا

میری رکھتا ہے سب خبر، لیکن
خود کہاں ہے۔ پتا نہیں دیتا

دیکھنا اب تو صرف یہ ہے کہ دِل
اُسے کب تک بھُلا نہیں دیتا

جا کے اُس کو، کیا وکیل، ظفرؔ
جو کوئی مشورہ نہیں دیتا

بے وفائی کر کے نکلوں یا وفا کر جاؤں گا
شہر کو ہر ذائقے سے آشنا کر جاؤں گا

تُو بھی ڈھونڈے گا مجھے شوقِ سزا میں ایک دن
مَیں بھی کوئی خوب صُورت سی خطا کر جاؤں گا

مُجھ سے اچھّائی بھی مت کر میری مرضی کے خلاف
ورنہ مَیں بھی ہاتھ کوئی دوسرا کر جاؤں گا

مُجھ میں ہیں گہری اُداسی کے جراثیم اس قدر
مَیں تجھے بھی اس مرض میں مُبتلا کر جاؤں گا

شور ہے اس گھر کے آنگن میں ظفرؔ کچھ روز اور
گنبدِ دِل کو کسی دن بے صدا کر جاؤں گا

فکر کر تعمیرِ دِل کی، وہ یہیں آ جائے گا
بن گیا جس دِن مکاں، خود ہی مکیں آ جائے گا

خود بھی وہ چالاک ہے، لیکن اگر ہمّت کرو
پہلا پہلا جھوٹ ہے، اُس کو یقیں آ جائے گا

کونسا ہم روز روز اُس کو بُلاتے ہیں یہاں
بے مروّت ہے، مگر، اتنا نہیں، آ جائے گا

ہم سے مِل لینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ اب
ہر کوئی اُس کو بُلائے، ہر کہیں آ جائے گا

زخمِ دِل تو سات پردوں میں چُھپا ہوگا کہیں
اور، سب کے سامنے داغِ جبیں آ جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اِس لشکر کشی سے حُسن کا
کچُھ علاقہ اور بھی زیرِ نگیں آ جائے گا

اب تو جیسے خود بھی آنا چاہتا ہے وُہ، ظفرؔ
گھر، گلی، ہوٹل جہاں چاہو وُہیں آ جائے گا

مسافرت کو بہانہ اگر بنا لیتا
وُہ میری آنکھوں میں اِک رہگزر بنا لیتا

گناہگار جو ہوتی مری نظر اِک بار
وُہیں میَں شاخِ تماشا پہ گھر بنا لیتا

لیے تو چلتے وہ دیوارِ سنگ تک مُجھ کو
میَں چُومتا اُسے اور اُس میں در بنا لیتا

غرض کچُھ اور نہ تھی دِل کے اِس گھروندے سے
وُہ توڑ دیتا، میَں بارِ دِگر بنا لیتا

تلاشِ یار میں پھرنا ہی تھا مری قسمت
تو پھر مَیں اپنا ٹھکانہ کدھر بنا لیتا

کبھی وہ مُہرِ خموشی کو توڑتا بھی ظفر
وُہ جھُوٹ بولتا، اور، مَیں خبر بنا لیتا

خُوشں ہے وُہ دے کے ہمیں خواب سُہانے خالی
پاس آتا نہیں، کرتا ہے بہانے خالی

بیٹھتا وہ بھی نہیں ایک جگہ پر ٹِک کر
اور، جانے لگے اپنے بھی نشانے خالی

جائیں گے ہم وہاں صرف اُس کی زیارت کرنے
آئے گا وہ یہاں قِصّے ہی سُنانے خالی

دِل کے ہمسائے میں نِکلو تو نظر آئیں گے
گھر کئی اور بھی تاریک، پُرانے، خالی

کام کچھ کیجیے ، بیگارِ محبّت ہی سہی
بیٹھ رہنے سے تو ہو جائیں خزانے خالی

شامِ شنوائی ترستی ہے دریچے سے الگ
جامِ رُسوائی لرزتا ہے سرہانے خالی

بُجھ گئیں خوابِ تمنّا سے چھلکتی آنکھیں
شہر برباد ہُوا ، اور ، ٹھکانے خالی

دِل سے غائب ہُوا اُس شکلِ خوش آغاز کا وِرد
رہ گئے ہاتھ میں تسبیح کے دانے خالی

کیا کریں ، عُمر ہی اتنی تھی محبّت کی ، ظفرؔ
گزُرے اُس میں بھی کئی ایک زمانے خالی

قیام ہے ابھی ، سُوئے سفر بھی آتا ہُوں
مَیں اِس طرف سے تو ہولُوں، اُدھر بھی آتا ہُوں

کوئی مجھے بھی وہاں اپنے ساتھ لے جائے
مَیں راستے پہ اِسی اُمّید پر بھی آتا ہُوں

تمھاری بزم میں ہونا ہے جو سلوک، اُس کی
مجھے خبر بھی ہے ، اور ، بے خبر بھی آتا ہُوں

کیا تو ہے مجھے گُمراہ بھی محبّت نے
مَیں گھُوم پھر کے ، مگر ، اپنے گھر بھی آتا ہُوں

کچھ اپنے ظاہر و باطن کو آپ بھی دیکھیں
کہ مَیں تو جیسا ہُوں ویسا نظر بھی آتا ہُوں

جہاں جہاں مرے عیبوں کی آندھیاں ہیں، ظفرؔ
وُہیں مَیں لے کے چراغِ ہُنر بھی آتا ہُوں

نشیبِ راہ میں ہے یا فرازِ بام پہ ہے
نگاہِ گُم شدہ کِس خواب کے خرام پہ ہے

تغافل اور توجہ کے ذائقے ہیں عجب
ابھی پتہ نہیں چلتا وُہ کِس مقام پہ ہے

کشش ہزار کرے آب و تابِ دانۂ دِل
وُہ راہ کار ہے، اُس کی نظر بھی دام پہ ہے

لہُو میں پیاس کی پرواز ہے وُہی پیہم
کہ انحصار اُسی تیغِ بے نیام پہ ہے

وُہ رنگ ابھی مری دیوارِ جاں تک آیا نہیں
جو تہ بہ تہ ترے ہونٹوں کے خُشک جام پہ ہے

بس ایک بُوند مُلاقات کی ہمارے لیے
کہ یہ مسافرِ دل مختصر قیام پہ ہے

یقینِ پختہ کی دیوار توڑ دی ہے، ظفرؔ
ہمارا دار و مدار اب خیالِ خام پہ ہے

مَیں چلتے چلتے اپنے گھر کا رَستا بھُول جاتا ہُوں
جب اُس کو یاد کرتا ہُوں تو کتنا بھُول جاتا ہُوں

ضروری ضابطے، فوری فرائض، قیمتی قدریں
مَیں اُس کو دیکھ کر سارا تماشا بھُول جاتا ہُوں

کہاں تک جائیں گے دونوں؟ کہاں سے واپسی ہو گی
وہ کیا کچُھ یاد رکھتا ہے، مَیں کیا کیا بھُول جاتا ہُوں

بھُلا دیتا ہُوں گر وُہ روکتا ہے پاس آنے سے
دوبارہ روکتا ہے، مَیں دوبارہ بھُول جاتا ہُوں

مقرّر کر بھی دُوں، کوئی جو مُجھ کو یاد دِلوائے
تو مَیں اُس آدمی کو ساتھ رکھنا بھُول جاتا ہُوں

نصیحت دِلنشیں رکھتا ہُوں اُن خاموش آنکھوں کی
مگر، بندہ بشر ہُوں، رفتہ رفتہ بھُول جاتا ہُوں

اگر کچھ یاد رہتا ہے مُجھے، تو بھُول جاتا ہی
مَیں کیسا یاد رکھتا ہُوں، مَیں کیسا بھُول جاتا ہُوں

ذرا سی بات پر بے حال ہو جاتا ہُوں ہنس ہنس کر
جو زخم اُس نے لگا رکھے ہیں گویا بھُول جاتا ہُوں

ظفرؔ، ضُعفِ دماغ اب اِس سے بڑھ کر اَور کیا ہو گا
کہ جاتا ہُوں وہاں اور واپس آنا بھُول جاتا ہُوں

ہمارے نقشِ طلب کا نشاں بھی خالی ہے
زمیں تو تھی ہی، یہاں آسماں بھی خالی ہے

جو ہے تو صرف زبانی ہے جمع و خرچ اُس کا
ہمارے حق میں تو وُہ مہرباں بھی خالی ہے

مچی رہی یہاں لفظوں کی لُوٹ مار، مگر
ہماری طرح کفِ دیگراں بھی خالی ہے

فریبِ گرمیٔ بازارِ حرف تو دیکھو
کہ بھیڑ بھی ہے وُہی، اور، دُکاں بھی خالی ہے

یہ ہیں خلا مرے اندر کہ خود خلاؤں میں ہُوں
یقیں تو خیر یقیں تھا، گماں بھی خالی ہے

رہے تو جانے کہاں تک رہے یہ صُورتِ حال
کہ پیاس بھی نہیں لگتی، کنُواں بھی خالی ہے

ہماری اپنی شرائط ہی سخت ہیں، ورنہ
کرایہ دار بھی حاضر، مکاں بھی خالی ہے

لگی ہو جیسے کوئی بد دُعا کسی کی، ظفرؔ
کہ جسم بھی ہے تہی خواب، جاں بھی خالی ہے

ہمیں شکایتِ پیہم سے اجتناب تو ہے
کچھ اعتراض، اگر سُن سکیں جناب، تو ہے

کیا ہے نرم دلِ سنگ کو اُس کے
کسی قدر ہمیں دعوائے انقلاب تو ہے

روا نہیں تھا اُسے لاجواب کر دینا
وگرنہ اُس کے سوالات کا جواب تو ہے

نہیں ہمارے لیے اُس کی روشنی، نہ سہی
کہ اِس فضا میں کہیں کوئی آفتاب تو ہے

پڑے گا کون بہار و خزاں کے چکّر میں
کہ خونِ ناب تو ہے، رنگ پرگلاب تو ہے

نئی عمارت اِسی خاک و خوں سے اُٹھے گی
قرارِ جاں یہی تصویرِ انقلاب تو ہے

ظفرؔ، بَلا سے وہ گردانتے نہیں دِل کو
حریمِ خاص میں کچھ دن سے باریاب تو ہے

یُوں بھی نہیں کہ دِل میں کوئی غم نہیں رہا
یہ سِلسلہ کچھ اِتنا منظّم نہیں رہا

ویسا ہے آج بھی یہ ترا حُسنِ بے اماں
ورنہ کہیں بھی ایک سا موسم نہیں رہا

دِل سے تو خیر دھو گئی بارش تمام نقش
دیوارِ شہر کا بھی وُہ عالم نہیں رہا

ضد پر وُہ اپنی آج بھی قائم تو ہے، مگر
اگلا سا وہ بیان میں دَم خَم نہیں رہا

چھوڑی ہے جب سے ہم نے ظفرؔ عاجزی کی خُو
اِتنا مزاج اُس کا بھی درہم نہیں رہا

نظر جُھکائے اِدھر سے اُدھر گزُرتا ہے
ٹھہرنا چاہتا بھی ہے، مگر، گزرتا ہے

یہ کیا طِلسم ہے آخر کہ آہ کا اُس پر
اثر نہیں ہے، گمانِ اثر گزرتا ہے

ابھی نہیں کوئی دھڑکا زیانِ زر کا اُسے
وہ دشتِ دِل سے ابھی بے خطر گزُرتا ہے

شکستِ خواب ہے زنجیرِ خواب کے پیچھے
سفر کے بعد غبارِ سفر گزرتا ہے

مَیں چُوم لیتا ہُوں اُس راستے کی خاک، ظفرؔ
جہاں سے کوئی بہت بے خبر گزرتا ہے

آنکھ میں شوخی نہیں چمکے گی، آنسو آئے گا
پہلے مَیں آیا تھا تیری سمت، اب تُو آئے گا

مَیں بھی کوشش تو کروں گا، بچ نکلنے کی بہت
تُو بھی سارا لے کے اپنے ساتھ جادُو آئے گا

دِل خریداری کو خالی جیب نکلے گا یہاں
جب بڑھالیں گے دُکانیں، یہ نکھٹّو آئے گا

زندگی ، لکھ لیجیے ، جتنی بھی ہے بے آب و رنگ
اس میں بھی اک لمحۂ رخسار و گیسو آئے گا

کاروبارِ شوق جب تک گرم ہے زیرِ فلک
باغ میں پریاں ، ظفرؔ ، جنگل میں آہو آئے گا

گلشنِ خواب ہُوں، تاراجِ حقیقت کر دے
اتنے احسان کیے، یہ بھی مروّت کر دے

یُوں محبّت سے نہ دے میری محبّت کا جواب
یہ سزا سخت ہے، تھوڑی سی رعایت کر دے

اہلِ بازار میں ہوتا نہ پھروں خوار و زبوں
ایک ہی بار اگر طے مِری قیمت کر دے

اُس نے کیا سوچ کے مجھ کو بھی کیا ساتھ خراب
اتنا دَم خم جو نہیں تھا کہ بغاوت کر دے

خُوگرِ ظُلم تھا مَیں آپ ہی، لیکن مَیں نے
کب کہا تھا کہ وہ ایسی مری حالت کر دے

کچھ احتیاط بھی اس میں بہت ضروری تھی
ہماری اُس کی ملاقات بس ادھوری تھی

جو ہونے والا تھا، اور، ہو نہیں سکا، اُس کا
اُسے بھی ڈر تھا، مجھے بھی اُمید پُوری تھی

بہت زیادہ نہ تھے فاصلے تمنّا کے
نہ اپنی راہ میں حائل دلوں کی دُوری تھی

ہمارا مقصدِ آخر جدائی تھا اُس سے
کہ اُس سے مِلنے کی خواہش فقط عبوری تھی

ہم اُس کے ہاں صفِ اوّل میں بیٹھتے کیونکر
کہ اپنے پاس خوشامد نہ جی حضوری تھی

مَیں خواب سبز تھا دونوں کے درمیاں میں ظفرؔ
کہ آسماں تھا سُنہرا، زمین بھُوری تھی

Scanned by CamScanner

اور اب سلسلۂ ناز نہیں رکھ سکتا
مجھے سچ کہنے سے وُہ باز نہیں رکھ سکتا

میرے حالات کو ناساز تو کر سکتا ہے
میرے حالات کو ناساز نہیں رکھ سکتا

پھر صدا دے کے چلا آئے گا خود ساتھ، کہ وُہ
اپنا پیکر پسِ آواز نہیں رکھ سکتا

اُس کو ناراض تو کر لیتا ہوں اکثر، لیکن
دیر تک میں اُسے ناراض نہیں رکھ سکتا

غیر کو تمغۂ رُسوائی نہ دینا ہرگز
کوئی کم ظرف یہ اعزاز نہیں رکھ سکتا

مَیں اِشاروں میں ترا بوجھ بتاؤں گا کبھی
مَیں تری پُشت پہ الفاظ نہیں رکھ سکتا

خود پریشان ہُوا چاہتی ہے یہ خُوشبُو
مَیں ترے راز کو اب راز نہیں رکھ سکتا

اپنے انجام کو پہنچوں گا بہت جلد اگر
شرمِ پابندیٔ آغاز نہیں رکھ سکتا

پَرِ پرواز ہی اِک ایسی مصیبت ہے ظفرؔ
جس کو مَیں شاملِ پرواز نہیں رکھ سکتا

انکار کی حدوں سے گزرتے کچھ اَور ہیں
ڈرتے کچھ اَور لوگ ہیں، مرتے کچھ اَور ہیں

کھوئے ہُوؤں کا لوگ لگاتے تو ہیں سُراغ
لیکن لہُو میں اپنے اُترتے کچھ اَور ہیں

اُن کو سنبھالنا ہے قیامت، کہ صُبحِ وصل
جتنا سمیٹتا ہُوں، بکھرتے کچھ اَور ہیں

ہر روز اُن کو ہاتھ دِکھاتا ہُوں مَیں کچھ اَور
الزام روز مُجھ پہ وہ دھرتے کچھ اَور ہیں

اب تو جہاں بھی اُس کی دِلاتا ہے کوئی یاد
نقش اُس کو بھُولنے کے نکھرتے کچھ اَور ہیں

پڑتا ہے جب سے راہ میں اپنی کِسی کا گھر
رُکنے لگے ہیں اور، ٹھہرتے کچھ اور ہیں

مَیں نے، کہ ہے یہ عیبِ سخن ہی مرا ہُنر
الفاظ رائج اَور تھے، برتے کچھ اَور ہیں

رُکو اگر تو روانی بحال کر لینا
مثالِ سبزہ ہمیں پائمال کر لینا

مطالبات ہمارے بہت زیادہ نہیں
بوقتِ فیصلہ اتنا خیال کر لینا

جو دُور دُور ہی رہنا کوئی بڑی شَے ہے
تو باکمال ہو، یہ بھی کمال کر لینا

میں اپنے خواب یہاں چھوڑ جاؤں گا اک دن
جو کر سکو تو ذرا دیکھ بھال کر لینا

مٹے گی روز کی اُلجھن تو ایک بار، ظفرؔ
جواب کچھ تو ملے گا، سوال کر لینا

لڑتے ہیں، مگر، معرکہ جاری نہیں رکھتے
یہ کیسی محبت ہے کہ طاری نہیں رکھتے

پہچان ہمیں خود ہی نہیں ہے اگر اپنی
پھر کیا ہے جو پروا وہ ہماری نہیں رکھتے

شرمندہ ہیں اپنے سے بھی اور اُس سے بھی نادم
ہم زخم بھی رکھتے ہیں تو کاری نہیں رکھتے

ہم کو ہی ضرورت ہے زیادہ، اُسے کہنا
ہم ہی کوئی تصویر تمھاری نہیں رکھتے

جھگڑا ہے تو کس بات پہ، جیسے ہیں ظفرؔ آپ
بس ٹھیک ہے، ایسوں سے وہ یاری نہیں رکھتے

نیّت کا تماشا وصل کی تاثیر جیسا ہے
کہ رمل بیٹھے نہیں اور ذائقہ انجیر جیسا ہے

مکمّل خامشی ہے یا غُبار آلُود حیرانی
ہمارے درمیاں جھگڑا کوئی تصویر جیسا ہے

مَیں روزانہ ہی اُس کے دل میں اپنا گھر بناتا ہُوں
مگر، یہ مسئلہ کُچھ حسرتِ تعمیر جیسا ہے

ترا خط پڑھ کے جیسے تیری صُورت دیکھ لیتا ہُوں
سمجھتا ہُوں، ترا چہرہ تری تحریر جیسا ہے

ذرا سی مہربانی اور بوجھل کر گئی دِل کو
اُسے کہنا کہ یہ انعام تو تعزیر جیسا ہے

ظفرؔ، بیمارِ اُلفت ہو تو دِل سے دُور مت رہنا
قسم لے لو، اثر اس خاک میں اکسیر جیسا ہے

وُہ دِن بھر کچھ نہیں کرتے ہیں، مَیں آرام کرتا ہُوں
وُہ اپنا کام کرتے ہیں، مَیں اپنا کام کرتا ہُوں

بجا ہے آپ نے تو میٹھی نظروں سے نہیں دیکھا
مُجھی کو وہم ہے، مَیں ہی خیالِ خام کرتا ہُوں

یہی مَیں ہُوں تو پکڑا جاؤں گا اِس جُرم میں اِک دِن
کہ جتنی خاص باتیں ہیں مَیں اُن کو عام کرتا ہُوں

مری کوتاہیاں مجھ کو ہمیشہ بھول جاتی ہیں
اسی خاطر میں اکثر شکوۂ ایام کرتا ہوں

لگاتا پھر رہا ہوں عاشقوں پر کفر کے فتوے
ظفرؔ، واعظ ہوں میں اور خدمتِ اسلام کرتا ہوں

جس نے نفرت ہی مجھے دی نہ ظفرؔ پیار دیا
مَیں نے سب کچھ اُسے کیوں ہار دیا، وار دیا

اِک نظر، نصف نظر شوخ نے ڈالی دِل پر
اور، اُس دشت کو پیرایۂ گلزار دیا

وقت ضائع نہ کرو، ہم نہیں ایسے ویسے
یہ اشارہ تو مجھے اُس نے کئی بار دیا

زندہ رکھتا تھا مجھے شکل دِکھا کر اپنی
کہیں رُوپوش ہُوا اور مجھے مار دیا

کوئی اِس بات کو تسلیم کرے یا نہ کرے
صُبح کی سَیر نے مجھ کو دلِ بیمار دیا

زردیاں ہیں مرے چہرے پہ ظفرؔ اُس گھر کی
اُس نے آخر مجھے رنگِ در و دیوار دیا

Scanned by CamScanner

پہلے تکرار کروں گا ہوسِ یار کے ساتھ
لگ کے سو جاؤں گا پھر ہجر کی دیوار کے ساتھ

بات جب کچھ بھی نہیں ہے تو مجھے دیکھ کے کیوں
اُس کی رنگت بھی بدل جاتی ہے رفتار کے ساتھ

عشق بیدل نہ ہُوا حُسن سے محرومی پر
لوگ رُخصت نہ ہُوئے گرمیٔ بازار کے ساتھ

شہر تھا شہر فقط اُس کے یہاں ہونے سے
کیسے گُزرے گی اُجڑتے ہُوئے آثار کے ساتھ

ابھی قیمت بھی لگائی نہ تھی اُس نے اپنی
اور، ہم چل بھی دیے اُٹھ کے خریدار کے ساتھ

سفرِ تازہ کی بُنیاد رکھی ہے جس پر
اُس بیاباں کی حدیں ملتی ہیں گُلزار کے ساتھ

اُس کی دیوار پہ لکھ آئیں غزل جا کے ظفرؔ
آج کل کچھ اُسے رغبت نہیں اخبار کے ساتھ

وُہ بے بسی ہے کہ دِل کو یقیں نہیں آتا
مکاں پُکار رہا ہے، مکیں نہیں آتا

خرامِ کُوچہ و بازار ہے نہ سیرِ چمن
وہ شوخ اب کئی دن سے کہیں نہیں آتا

خیال اُس کا بہت خوش ہے وسعتِ دِل میں
ہمارے پاس یہ صحرا نشیں نہیں آتا

Scanned by CamScanner

ہماری ساری فتوحات کے برابر ہے
وہ ایک شہر کہ زیرِ نگیں نہیں آتا

کچھ اس زمیں پہ اندھیرے ہیں آرزو کے ظفرؔ
کچھ آسماں پہ وہ ماہِ مُبیں نہیں آتا

نہیں کہ مِلنے مِلانے کا سلسلہ رکھنا
کِسی بھی سطح پہ کوئی تو رابطہ رکھنا

مَریں گے لوگ ہمارے سوا بھی تم پہ بہت
یہ جُرم ہے تو پھر اس جُرم کی سزا رکھنا

مدد کی تُم سے توقّع تو خَیر کیا ہو گی
غریبِ شہرِ ستم ہُوں، مِرا پتا رکھنا

بس ایک شام ہمیں چاہیے، نہ پُوچھنا کیوں
یہ بات اَور کِسی شام پر اُٹھا رکھنا

نئے سفر پہ روانہ ہُوا ہُوں از سرِ نَو
جب آؤں گا تو مرا نام بھی نیا رکھنا

فصیلِ شوق اُٹھانا ظفرؔ، ضرور، مگر
کسی طرف سے نِکلنے کا راستا رکھنا

دیکھنا بارِ دِگر دیکھنا ہے
کیا کوئی ایک نظر دیکھنا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ دیکھے وُہ بھی
ورنہ کیا اَور کدھر دیکھنا ہے

دیکھتا اَور طرف ہے، یعنی
اُس کے برعکس جدھر دیکھنا ہے

کھولنا ہے ابھی سامانِ سفر
اور، امکانِ سفر دیکھنا ہے

تجھے دیکھا ہے بہت دن ہم نے
اے بُرے! اب ترا گھر دیکھنا ہے

اِہتمام اِتنا ہے اور، اُس بُت کو
اِک سرِ راہگزر دیکھنا ہے

توڑ لینا ہے تعلّق اُس سے
چند روز اَور، مگر، دیکھنا ہے

بُجھتی جاتی ہیں یہ آنکھیں ہر دم
اور، ابھی خوابِ ہُنر دیکھنا ہے

سُو بہ سُو سایۂ شُہرت ہے، ظفرؔ
کاٹ کر یہ بھی شجر دیکھنا ہے

لگا ہُوں جب شام کے کنارے
چمک اُٹھے بام کے کنارے

قدیم ہونٹوں پہ کانپتے ہیں
کِسی نئے نام کے کنارے

مرے کناروں سے مِل چُکے ہیں
اِک اور کہرام کے کنارے

الگ الگ آرزو کی لہریں
جُدا جُدا کام کے کنارے

ابھی تو پایاب ہے محبّت
چلے چلو تھام کے کنارے

اب اور کب تک پڑا رہوں گا
مَیں خواہشِ خام کے کنارے

کہیں یہ آغاز کا بھنوّر ہے
نہ کوئی انجام کے کنارے

خامشی اچھی نہیں، انکار ہونا چاہیے
یہ تماشہ اب سرِ بازار ہونا چاہیے

خواب کی تعبیر پر اصرار ہے جن کو ابھی
پہلے اُن کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

ڈُوب کر مرنا بھی اسلوبِ محبت ہو تو ہو
وُہ جو دریا ہے تو اُس کو پار ہونا چاہیے

اب دُہی کرنے لگے دیدار سے آگے کی بات
جو کبھی کہتے تھے بس دیدار ہونا چاہیے

بات پُوری ہے، ادھوری چاہیے اے جانِ جاں
کام آساں ہے، اِسے دشوار ہونا چاہیے

دوستی کے نام پر کیجے نہ کیوں کر دشمنی
کُچھ نہ کُچھ آخر طریقِ کار ہونا چاہیے

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اُس پر ظفرؔ
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

جہاں میرے نہ ہونے کا نشاں پھیلا ہُوا ہے
سمجھتا ہُوں غُبارِ آسماں پھیلا ہُوا ہے

مَیں اِس کو دیکھنے اور بھُول جانے میں مگن ہُوں
مرے آگے جو یہ خوابِ رواں پھیلا ہُوا ہے

اِنہی دو حیرتوں کے درمیاں موجود ہُوں مَیں
سرِ آبِ یقیں عکسِ گُماں پھیلا ہُوا ہے

رہائی کی کوئی صُورت نکلنی چاہیے اب
زمیں سہمی ہُوئی ہے اور دُھواں پھیلا ہُوا ہے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا اِس کا کہ آخر
کہاں تک سایۂ عہدِ زیاں پھیلا ہُوا ہے

کہاں ڈُوبے، کدھر اُبھرے بدن کی ناؤ دیکھیں
کہ اتنی دُور تک دریائے جاں پھیلا ہُوا ہے

مَیں دِل سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہُوں آخر
مرے ہر سُو یہ دشتِ بے اماں پھیلا ہُوا ہے

مجھے کچُھ بھی نہیں معلوم، اور، اندر ہی اندر
لہُو میں ایک دستِ رائگاں پھیلا ہُوا ہے

ظفرؔ، اب کے سخن کی سرزمیں پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے اور رنگِ بیاں پھیلا ہُوا ہے

درکار ہے مجھے تو دوائی کے طَور پر
رکھتے ہیں ایک شَے جو مٹھائی کے طَور پر

آیا بھی ہے اگر کبھی آنکھوں میں خوابِ وصل
آیا ہے ایک خوابِ جُدائی کے طَور پر

جیسے بھی ہو، اُٹھا تو دِیا بزم سے مجھے
نفرت کی وجہ سے کہ صفائی کے طَور پر

اچھائی مُجھ میں ہے بھی کوئی تو ستم ظریف
کرتا ہے اس کو پیش بُرائی کے طَور پر

سردی میں گرم رکھتی ہے کیا آتشِ حسد
لیتا ہُوں اِس سے کام رضائی کے طور پر

محرومیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم
حق اپنا مانگتے ہیں گدائی کے طور پر

وُہ وقت ہے کہ عرضِ تمنّا بھی اہلِ شوق
کرتے ہیں بس لگائی بجھائی کے طور پر

وجدان ایک سیلِ فلک سَیر تھا جسے
ہم نے بچھا رکھا ہے چٹائی کے طور پر

سُنتے ہیں اور لُطف اُٹھاتے ہیں سب ظفرؔ
میرا کلام ہرزہ سرائی کے طور پر

یہ مت سمجھو کنارا کرنے والا ہوں
ابھی تو صرف اشارا کرنے والا ہوں

جسے کر کے بہت نادم ہوا تھا مَیں
وہی حرکت دوبارہ کرنے والا ہوں

جسے کرتا رہا ہوں مَیں پسند اِتنا
اُسی کو اب گوارا کرنے والا ہوں

کِسی کی پردہ داری کے وسیلے سے
مَیں خود کو آشکارا کرنے والا ہوں

مری آنکھیں کسی دریا میں پھینک آؤ
کہ میں اپنا نظارا کرنے والا ہوں

یہ دل مسجد تو بن پایا نہیں مجھ سے
اسے اب گوردوارہ کرنے والا ہوں

میں خود کو پرزہ پرزہ جوڑنے کے بعد
دوبارا پارہ پارہ کرنے والا ہوں

بہت قطروں کو دریا کر چکا، اور اب
میں سورج کو ستارہ کرنے والا ہوں

ظفرؔ، شاعر تو میں اچھا نہیں اتنا
بہر صورت، گزارہ کرنے والا ہوں

شبِ اُمّید بھی ہے، ہجر کی اِس شام کے بعد
اِک سفر اور ہے اِس وقفۂ آرام کے بعد

آنکھ رہ جائے گی اِک منظرِ بے شکل میں گُم
جی ٹھہر جائے گا اِک لرزشِ بے نام کے بعد

حسرتِ خوابِ فراغت ہے وہی آنکھوں میں
کام کچھ اور بھی یاد آئے مجھے کام کے بعد

منزلِ وصل سے آگے بھی گزرنا ہے مجھے
ایک آغاز ابھی اور ہے انجام کے بعد

سر میں اِک خواہشِ طفلانہ ہی کیا کم ہے ظفرؔ
اور کیا چاہتے ہو اِس ہوسِ خام کے بعد

نہ کوئی بات کہنی ہے نہ کوئی کام کرنا ہے
اور اس کے بعد کافی دیر تک آرام کرنا ہے

اِس آغازِ محبت ہی میں پورے ہو گئے ہم تو
اسے اب اور کیا شرمندۂ انجام کرنا ہے

بہت بے سُود ہے لیکن ابھی کچھ اور دن مجھ کو
سوادِ صُبح میں رہ کر شمارِ شام کرنا ہے

نشاں دینا ہے مَیں نے کچھ غبار آلود سمتوں کا
کوئی کافی پُرانا راز طشت از بام کرنا ہے

بدی کے طور پر کرنی ہے نیکی بھی محبت میں
کہ جو بھی کام کرنا ہے وہ بے ہنگام کرنا ہے

ابھی تو کارِ خیرِ اِتنا پڑا ہے سامنے میرے
ابھی تو مَیں نے ہر خاص آدمی کو عام کرنا ہے

کوئی بدلہ چُکانا ہے وفا کے نام پر اُس سے
مسافت کے لیے اُٹھنا ہے اور بسرام کرنا ہے

کمائی عمر بھر کی ہے یہی اِک جائداد اپنی
سو، یہ خوابِ تماشا اب کسی کے نام کرنا ہے

اِک آغازِ سفر ہے اے ظفرؔ یہ پُختہ کاری بھی
ابھی تو مَیں نے اپنی پختگی کو خام کرنا ہے
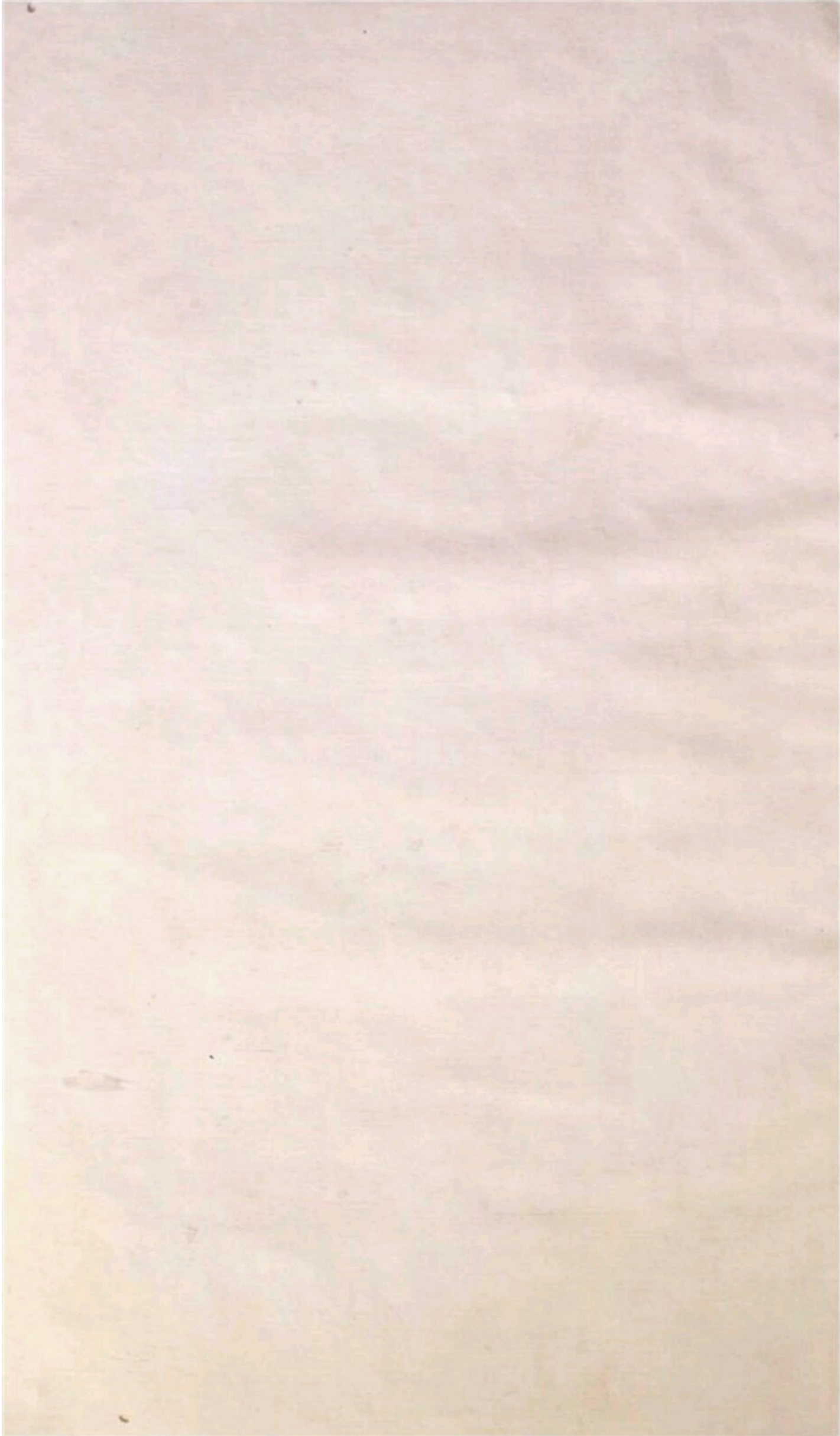
تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں ۔
مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں ۔
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے
ایڈمن ۔ سید حسین احسن
0344-818-3736
0314-595-1212

عشقِ بخیر
رحمان فارس
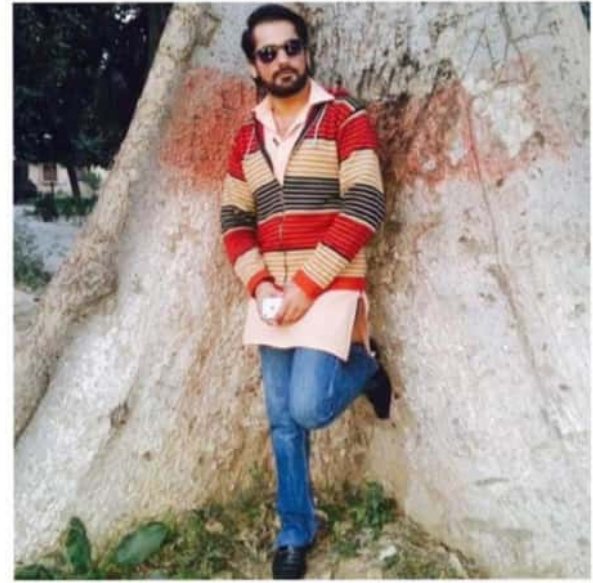
کہانی ختم ہوئی اور ایسے ختم ہوئی
کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے
پھر اُس کے بعد زمانے نے مجھ کو روند دیا
مَیں گِر پڑا تھا کسی اور کو اُٹھاتے ہوئے

☆

عشق ٹُوٹا تو استخارہ کیا
اور پھر عشق ہی دوبارہ کیا
مَیں تو محفل سے اُٹھنے والا تھا
پھر کسی آنکھ نے اشارہ کیا

☆

مجھ کو خود میں جگہ نہیں ملتی
تُو ہے موجود اِس قدر مجھ میں

☆

عشق وہ علمِ ریاضی ہے کہ جس میں فارس
دو سے جب ایک نکالیں تو صفر بچتا ہے

☆

تُو نے بہت خراب کیا ہے مجھے مگر
اس شعر میں خراب کا مطلب کچھ اور ہے

☆

دیکھنے والا تھا منظر جب کہا درویش نے
کج کلا ہو! بادشا ہو! تاجدارو! تخلیہ

☆

عشق بخیر

شاعری

رحمان فارس

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

لمحۂ تفاخر، جلوۂ تشکر اور مُعجزۂ عشق کے نام

لمحۂ تفاخر جو میرے والد کے ماتھے پر چمکتا مان ہے

جلوۂ تشکر جو میری والدہ کی آنکھ میں دمکتا شُکر کا آنسو ہے

اور مُعجزۂ عشق جو شہر بانو ہے

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما !
اے طبیبِ جُملہ عِلّت ہائے ما !

فہرست

غزل بہانہ کروں

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

غزل اُس نے چھیڑی

تراجم

اک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

سفرنامے

از کُجا می آید ایں آوازِ دوست؟

حیرت سرائے

اے سراپا غزل کی رعنائی

سبز کھجوروں کی قطار

مقطعِ سلسلۂ شوق

پارۂ سنگ

بابِ گریہ

رُباعیات

خود بنام خود

پیارے صاحب!

ایس ایم ایس پر تو ہماری پیغام رسانی ہوتی ہی رہتی ہے۔ رومن میں لکھی ہوئی اُردو خطِ نستعلیق کا لطف نہیں دیتی۔ سوچا کیوں نہ تمہیں خط لکھا جائے۔ کیا زمانہ تھا کہ غزل میں خط کے مضمون پر اساتذہ شعر کہا کرتے تھے۔ کبھی خط کے ساتھ پیغامِ زبانی بھی ہوتا۔ کبھی خط کے جواب میں قاصد کی لاش آتی اور اضطرابی کیفیت میں اُن کی طرف سے خود ہی جواب میں خط لکھے جاتے تھے۔ آج ڈاکخانہ کے باہر نصب لیٹر بکس خون سے لکھے گئے خطوں کو ترس گیا ہے۔ شب و روز اُس کا انتظار کرتا رہتا ہے جس نے کبھی نہیں آنا۔ مَیں نے اُس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مَیں ضرور کسی پیارے کو خط لکھوں گا اور پہنچانے کے لیے اُس کے سپرد کروں گا چنانچہ آج اُس وعدے کو پورا کر رہا ہوں۔

پہلے تو اپنی کیفیت کا بتاؤ۔ فارس! تمہاری شاعری پڑھ کر خوشیوں بھری حیرانی سے ہمکنار ہوتا جا رہا ہوں۔ خوشی اس بات کی کہ آدھی صدی کے موڑ پر ایک ایسے نوجوان شاعر کو پڑھ رہا ہوں جس نے مجھے پلک سے روح تک بھگو دیا ہے اور حیرانی اس بات کی کہ تمہیں وہی غزلیں دُنیا بھر کے مشاعروں میں پڑھ کر مشاعرے پیٹتے دیکھتا ہوں۔ ایک نہیں مَیں نے بیسیوں مشاعروں میں تمہیں سنا ہے اور گھر آ کر کاغذ پر پڑھا

ہے۔ مَیں نے یہ حرکت اس لیے کی کہ مشاعرے پر قد بنانے والے شاعر کتاب میں بونے نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک عہد کا شاعر وہی ہوتا ہے جسے خاص و عام یکساں طور پر پسند کرتے ہوں۔ ربِ اظہار کی قسم! تمہیں ہر طبقے میں پسند کیا جا رہا ہے۔ تم مرتضیٰ برلاس کے حلقۂ یاراں میں سراہے جا رہے ہو، خالد احمد کی منڈلی میں بھی تمہارے شعر ہیں اور این سی اے کی کینٹین پر بیٹھی لڑکیاں بھی تمہاری غزلوں کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ نئی نسل کو جس طرح کی محبت اور محبت کی شاعری چاہیے وہ صرف تمہارے پاس ہے۔ جو مجاز میں حقیقت کو پیدا کرتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ حافظ شیرازی سے لے کر سراج الدین ظفر تک رہنما ستارہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر چل رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات کرتا چلوں۔ ہمارا عہد دہشت گردی کا عہد ہے۔ ہم لوگ اسمِ عشق اور الحفیظ والاماں کی تسبیح ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں ایسی محبت بھری شاعری کی ضرورت تھی جو محبت کی کیفیات کے کسی اور جہاں میں پہنچا دے۔ یہی ضرورت تھی جس کے باعث میڈونا اور پھر امریکہ کی نئی نسل نے مولانا روم کی شاعری کو گایا اور روح کی پیاس بجھائی۔

فارس! تم جانتے ہو بدن کی پیاس بجھ جایا کرتی ہے روح کی پیاس نہیں بجھتی۔ تم نے اپنی غزلوں میں ''حالتِ حال'' اور ''حالتِ وصال'' کی حدوں کو دھنک کے رنگوں کی طرح مدغم کر دیا ہے۔ دونوں میں فرق کو قائم رکھتے ہوئے رنگ اس طرح ملائے ہیں کہ یہ نہیں بتایا جا سکتا کون سا رنگ کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا رنگ کہاں سے شروع ہوتا ہے کیوں نہ تمہیں تمہارے شعر سنائے جائیں۔

ذرا ئے اٹھی جو دھمال کی تو چمک بڑھی خدو خال کی
ہوئی انتہا جو وصال کی تو خدا ملنگ میں آ گیا

☆☆☆

بدن وصال کا خواہاں ، دماغ ضبط میں گم
عجیب شخص ہے ، ٹکڑوں میں بٹ کے ملتا ہے

☆☆☆

کوئی بھیک روپ سروپ کی، کوئی صدقہ حسن و جمال کا
شب و روز پھرتا ہوں در بدر مَیں فقیر شہرِ وصال کا

☆☆☆

وہ روشنی تھی کہ آنکھیں تو اٹھ نہیں پائیں
مَیں تیرے پاؤں سے جانا کہ روبرو تُو ہے

☆☆☆

تم واقعی شہرِ وصال کے فقیر ہو۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے تم نے اپنی کتاب کا نام بھی ''مَیں فقیر شہرِ وصال کا'' رکھا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم بھی اِس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ''دین سلامت ہر کوئی منگے عشق سلامت کوئی ہُو''۔ تم نے عشق کی خیر مانگی اور کتاب کا نام عشق بخیر رکھ دیا۔ اس نام سے تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم دعا پر یقین رکھتے ہو۔

کیا تمہیں پتہ ہے کہ اب یہ دعا نئی نسل کی دعا بن چکی ہے اور اس شہر میں جونہی سورج طلوع ہوتا ہے عشق کرنے والے صبح بخیر کی بجائے ایک دوسرے کو 'عشق بخیر' کا ایس ایم ایس کرتے ہیں، عشق اور شاعری پر آئے ہوئے بُرے دنوں میں ایک دوسرے کو یہ دعا دیتے ہیں اور تمہارے دلوں کو نشانہ بنانے والے شعر سناتے ہیں:

دیارِ ہجر کی سونی اداس گلیوں میں
پکارتا ہے کوئی صبح و شام عشق بخیر

☆☆☆

مجھ کو خود میں جگہ نہیں ملتی
تُو ہے موجود اس قدر مجھ میں

☆☆☆

زباں پر مصلحت ، دل ڈرنے والا
بڑا آیا محبت کرنے والا

☆☆☆

عہدِ وفا سے کس لیے خائف ہو میری جان
کر لو کہ تم نے عہد نبھانا تو ہے نہیں

☆☆☆

کل ایک نوجوان نے مجھے ایک عجیب بات بتائی ۔ کہو تو تمہارے ساتھ شیئر کروں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ فرازؔ کے بعد یہ فارسؔ پہلا شاعر آیا ہے جس نے ہمارے لیے محبت کو آسان بنا دیا ہے۔ اب ہمیں شعروں کے انتخاب کے لیے رسوا نہیں ہونا پڑتا بلکہ فارسؔ کے شعر سنا کر ہم دل کا مدعا کامیابی سے بیان کر دیتے ہیں۔ وہ نوجوان یہ باتیں کر رہا تھا کہ مجھے شرارت سوجھی۔ مَیں نے جھٹ سے پوچھا، ''کیا اب کسی کے ہاتھ کا کنگن بننے سے بات نہیں بنتی ؟'' یقین کرو وہ نوجوان ناراض ہو کر جانے لگا۔ مَیں نے اُسے بمشکل روکا۔ کہنے لگا۔ ''مجید امجد کے بُندے کو کنگن بنا کر ایک جنریشن کو بیوقوف بنایا جا چکا ہے، وہ لوگ بڑے ہو گئے ہیں حتیٰ کہ انھوں نے مجید امجد کو پڑھ لیا ہے اور اُن پر ساری حقیقت کھل چکی ہے۔ ہمیں ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو محبت کے ڈانڈے صوفی ازم سے ملا دے۔ ہمارا عہد کچی جذباتیت پر یقین نہیں رکھتا۔ ہم محبت کے اداکاروں سے تنگ آ چکے ہیں۔''

فارس! وہ نوجوان یہ باتیں کر کے چلا گیا لیکن اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا۔

مجھے خیال آیا کہ صرف محبت کے حوالے سے ہی دو نمبری نہیں کی گئی بلکہ خود ساختہ صوفی شاعر بھی میدان میں آ گئے ہیں۔ صوفیانہ اصطلاحات کو شعر میں لا کر صوفی شاعر ہونے کے دعویدار بن بیٹھے ہیں۔ اِن میں اور اُن شاعروں میں کوئی فرق نہیں جو عشق کی واردات سے گزرے بغیر صرف عشق کا لفظ تکرار کے ساتھ شاعری میں لاتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ ہم عشق کے شاعر ہیں۔ یہ صوفیانہ واردات کے بغیر ہی خود کو صوفی ظاہر کرتے ہیں۔ اگر اصطلاحات کے ذریعے شاعری ہو سکتی تو ہمارے عظیم صوفی شعراء کبھی مجاز کے پیرائے میں اپنی واردات بیان نہ کرتے۔ مَیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تم نے اپنے دور کے دونوں رویوں کو دیکھا اور سمجھا ہے۔ اس لیے تمہاری شاعری میں وہ رنگ آ گیا ہے جو اس دور کی نئی نسل کو چاہیئے۔ میرے نزدیک آج وہ شخص صوفی ہے جو مذہبی شدت پسندی کے الاؤ میں محبت بھری شاعری کے پھول کھلاتا ہے۔ مَیں تمہیں تمہارا راستہ دکھا رہا ہوں جس پر تم چل پڑے ہو۔ یہ مشکل سفر ہے۔ ہر چند کہ اس سفر میں تمہیں بے انتہا مقبولیت بھی ملی ہے اور قبولیت بھی۔ لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔ جمالیات کو بیان کرتے ہوئے قلندر بخش جرأت کے قریب سے ہو کر گزر جانا...... تم نے تاریخ میں یقیناً وہ واقعہ پڑھا ہو گا۔ ایک مشاعرے میں جرأت نے پڑھا اور سامعین نے داد کی انتہا کر دی۔ جرأت پڑھ کر میؔر صاحب کے پہلو میں آ بیٹھے اور پوچھنے لگے ''میؔر صاحب کیوں کیسا پڑھا میں نے؟'' جواب ملا۔ ''میاں بس یہی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔ شاعری تمہارے بس کی بات نہیں'' تم سے اس کا ڈر تو نہیں لیکن یہ شہرت کی دیوی بڑے بڑوں کو ورغلا کے لے جاتی ہے۔ عام لوگوں کو شاعری کی سطح پر لانے کے بجائے شاعر کو عام لوگوں کی سطح پر لے جاتی ہے۔ مَیں بھی عجیب شخص ہوں، تم پر بات کرتے کرتے اندیشے کی پھسلن کا شکار ہو گیا۔ خیر چھوڑو، عشق بخیر کی دُعا مانگنے والا کبھی نہیں پھسل سکتا۔ چلو تمہارے دو شعر سناتا ہوں۔ میرا تو اس غزل پر رقص کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اُس طرف نت نئے رنگوں میں جھلکتا ہُوا حُسن
اِس طرف ایک ہی آواز دما دم آہا
محفلِ حال ہے سب مل کے پکارو یارو
نعرۂ چشم و لب و عارضِ جانم آہا

پیارے صاحب! مَیں حالتِ حال میں، حالتِ وصال میں، حالت ہجر میں، حالتِ رقص میں، حالتِ غزل میں غرض جملہ حالتوں میں تمہاری شاعری سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ تم نے جس طرح روایت کو پڑھا اور پھر اُس سے لطفِ کلام پیدا کیا وہ نئی نسل کے لیے بہترین اور کامیاب ترین رول ماڈل کا کام دے گا۔ غلط ہیں وہ لوگ جو شاعری کے ختم ہونے کی بات کر کے اپنے بنجر پن کو چھپاتے ہیں۔ تمہیں مَیں ایک مزے کا واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ شکیل جاذب اور مَیں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب مدتوں بعد تشریف لے آئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے ''شاعری کا انتقال ہو چکا ہے۔ سب لوگ اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' مَیں نے اس تابڑ توڑ حملے کو خاموشی سے پسپا کرتے ہوئے چائے کا پوچھا۔ شکر ہے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آج کل چائے بھی اچھی نہیں بن رہی۔ چائے آ گئی۔ کافی دیر کے بعد مَیں نے دریافت کیا کہ ''حضور! آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟'' کہنے لگے کہ ''مجھے شعر کہے زمانے ہو گئے ہیں۔'' اُن کی اس بات میں اُن کے سوال کا جواب موجود پا کر مَیں نے عرض کیا کہ ''حضور! آپ لکھ رہے ہوتے تو شاعری کا انتقال کیوں ہوتا؟ یہ آپ کا بنجر پن ہے جو آپ کو سب میں دکھائی دے رہا ہے۔''

فارس! صرف اُن صاحب پر ہی موقوف نہیں ایسے کردار ملتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ابوظہبی کے مشاعرے میں ایک منہ پھٹ نے اس قسم کی گفتگو کی۔ مَیں نے کسی بحث میں پڑے بغیر تمہارے یہ مقبولِ عام شعر سنائے:

روز آتی ہے مرے پاس تسلی دینے
شبِ تنہائی! بتا تُو مری کیا لگتی ہے

☆☆☆

وہ ٹال دیتا ہے ایک سورج کی اشرفی پر
اگرچہ روتا ہوں رات بھر آسماں کے آگے

☆☆☆

بہت شریر تھا مَیں اور ہنستا پھرتا تھا
پھر اِک فقیر نے دے دی دعا اداسی کی

☆☆☆

پھر اُس کے بعد زمانے نے مجھ کو روند دیا
مَیں گِر پڑا تھا کسی اور کو اٹھاتے ہوئے

☆☆☆

پھر اُس کے بعد عطا ہو گئی مجھے تاثیر
مَیں رو پڑا تھا کسی کو غزل سناتے ہوئے

☆☆☆

آپ چاہیں تو جان بھی لے لیں
آپ کو اختیار ہے سائیں

☆☆☆

پیارے صاحب! یہ دعا دینے والا فقیر اور صاحبِ اختیار سائیں کہاں ہوتا ہے؟ مِلے تو بعد از سلام میرے لیے بھی اس قسم کی دعا کی درخواست کرنا۔ فارس! تم غزل کا یعنی میرا مستقبل ہو۔

جیتے رہو

اور سدا دلوں پر حکمرانی کرتے رہو

آخر میں میری طرف سے تمہارے لیے تمہارے لفظوں میں ایک دعا......

میرے کاسے کو ہے بس چار ہی سِکّوں کی طلب
عشق ہو، وقت ہو، کاغذ ہو، قلم ہو آمین

تم۔ہارا
عباس تابش

تمہاری اور میری کہانی

یومِ الست: (بوقتِ عصر)

تمام کائناتوں اور کُل زمانوں جہانوں کی رُوحوں کا ہجوم تھا۔ کیا کٹّر کافر، کیا من موہنے مومن، کیا مرد، کیا عورت، سب وہیں تھے اور چُپ نہیں تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں، بولیاں، جملے، سرگوشیاں، صدائیں اور ندائیں کان میں پڑتی تھیں کہ جن کا نہ معنی معلوم نہ مدعا۔ ایسی بھڑکیلی بھیڑ بھاڑ کہ خدا کی پناہ۔ ارے ہاں، یاد آیا، خود خدا کہیں دُور مسندِ خدائی پر براجمان، تھوڑا حیران، موجود تھا۔ ایسا یکتا کہ جیسے.... جیسے تشبیہ تک کوئی نہ ہو۔ مَیں، پانچویں قطار میں بہتّرواں چُپ چاپ کھڑا تھا۔ گنگ ایسا مانو زبان سرے سے ہے ہی نہیں۔

پھر اچانک میری نظر اپنے پہلو میں کھڑی تم پر پڑی۔

اور ربِ الست کی قسم، دید کے اوّلین لمحے میں ہی مَیں نے جان لیا اور مان لیا کہ تم عشق ہو اور صرف تمہی عشق ہو۔ حیرت بھی تمہی ہو، حسرت بھی، رنگ بھی تمہی ہو، سنگ بھی۔ مژدہ بھی تمہی ہو، صدمہ بھی۔ تم غزل ہو اور نظم، تم تنہائی ہو اور بزم، خاموشی بھی تمہارا نام ہے، سرگوشی بھی، آواز بھی تمہارا نام ہے، راز بھی۔

مَیں نے نظریں اُٹھائیں، عشق سے کام لیا اور رتّی برابر جھجکے بغیر تمہارا ہاتھ تھام

لیا۔ تمہاری ملکوتی مسکان کا وہ جھلمل لمحہ اب تک میری حیرت کے حافظے پر نقش ہے۔ جب ہر سُو ''الست بربکم؟'' کے جواب میں ''بے شک، تُو ہی ہمارا رب ہے'' کا کائناتی غلغلہ اُٹھا تب بھی مَیں چپ چاپ تمہیں تک رہا تھا۔ بنا سانس لیے۔

اور پھر یک دم تم میرے ہاتھ سے پانی کے مانند بوند بوند پھسل کر ماحول میں حل ہونے لگیں۔ مَیں چیختا چِلّاتا رہا اور تم ہولے ہولے کائنات اور وقت میں گھل مل گئیں۔ مگر جاتے جاتے تمہاری وہ آخری سرگوشی:

''مجھے ڈھونڈتے رہنا۔ مَیں تمہیں مِلتی رہوں گی۔ ہر رُوپ میں۔ مجھے ڈھونڈتے رہنا۔''

تبھی مجھے پہلا گریہ عطا ہوا اور میری ابدی تلاش کی ابتدا ہوئی۔ پہلے آنسو کا نمک چکھا تو پُراسرار جھٹپٹے کا سماں تھا۔ تم نہ جانے کہاں گئیں، مَیں نہ جانے کہاں تھا۔

موجودہ بدن میں روزِ اوّل:

بہار کی ستائیسویں تھی۔ طاق رات اور جمعۃ المبارک کا دن۔

فجر کی مدھر سپید اذانیں ہو رہی تھیں جب مَیں نے اِس جسم میں آنکھ کھولی۔ پہلی نظر ماں کے گال پر بہتے آنسو پر پڑی اور اُس میں مجھے تمہاری جھلک جھمک چمکتی دکھائی دی۔ تبھی مجھے دوسرا گریہ عطا ہوا مگر اب کے یہ خوشی کا گریہ تھا۔ تمہارا دوبارہ آن ملنے کا وعدہ جھوٹا نہیں تھا۔ تب مَیں رقص نہیں کر سکتا تھا، بہت چھوٹا تھا نا، سو چیخیں مار کر والہانہ رویا۔ ماں نے گھبرا کر مجھے سینے سے لگایا، پہلی لوری سنائی۔ مَیں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ ماں کی آغوش کی گرماہٹ زیادہ پُرسکون ہے یا اُس کی آواز کی نرمی۔ تب نہ گوشِ ہوش میسر تھا نہ چشمِ بینا۔ مگر ماں کی بے لفظ لوری میں جو للک، لحن اور لَے تھی، وہ کہیں من اندر بس گئی۔ بابا نے کان میں اذان دی تو مجھ پر پہلا قافیہ کھلا۔ دُور کہیں نانی ماں سورۂ رحمان کی تلاوت

کر رہی تھیں۔ آیت آیت ترتیب، ترتیل، تناسب اور توازن، حرف حرف موزوں ترین۔ عین اُس لمحے کلامِ پاک کی آواز کے سائے میں مجھے حسرتِ اظہار عطا ہوئی اور اپنی قدیم اور عظیم تلاش یعنی تمہیں کھوجنے کے لیے شاعری کا روشن چراغ میرے ننھے منے ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ چراغ کی لَو حیرت سے بنی تھی۔ میری آنکھوں کی طرح۔

پہلا کلمہ طیّب:

مَیں بولا تو میرا پہلا لفظ ماں تھا۔
اور کچھ ہوتا بھی کیسے؟ تم خود بتاؤ۔

ماں ہی نے تو مجھے خاموشی کے ہجے اور اسرار پڑھائے، حرف حرف آوازوں کا چوگہ مجھ بے زبان کے منہ میں ڈالا۔ لفظوں کی روشنی پہچاننا سکھائی، معانی کی خوشبو سے تعارف کرایا اور بالآخر مجھ گنگ کو نطق دیا۔ یہ جو ملکوں ملکوں میرے بولنے کا چرچا ہے، ماں ہی نے اپنا خونِ جگر خرچا ہے۔ میرا سخن اُسی کی لگن، میرا کلام اُسی کا اہتمام، میری آواز اُسی کا اعجاز۔

اور پھر میرے بابا ہیں جنہوں نے مجھے لقمہ لقمہ حق حلال کی حُرمت بھرا رزق کھلایا۔ پہلے قلم کتاب سے نہیں، اپنے عمل کی آب و تاب سے لکھایا پڑھایا۔ بات سے نہیں، ذات سے سکھایا۔ پھر ایک دن اُنگلی تھامے مدرسے میں لے گئے کہ چل! اب قلم دوات تھام، رمزِ کتاب سیکھ۔ زندگی کرنے کے آداب سیکھ۔

تب بابا لائبریرین تھے اور اماں اُستانی۔ سو ہمارے گھر میں کتابوں کی بہت رونق تھی، مانو تین چوتھائی حصے میں تو کتابیں رہتی تھیں، بچے کھچے میں ہم۔ سو پانچ سات برس کی عمر ہی سے میری پکی دوستی ہو گئی کتابوں سے اور خوابوں سے اور اُن سے جُڑے سرابوں عذابوں سے۔ مجھے اکثر ایسی جھمکی جھلکی سی دِکھتی تھی گویا اِدھر مَیں نے کتاب کھولی، اُدھر تم نے ورق ورق سے تانکنا اور کہانی کہانی سے جھانکنا شروع کیا۔ اِس شریر چھپن چُھپائی، معصوم لکن

مٹی اور دلبر آنکھ مچولی میں مَیں نے سب کتابیں چاٹ ڈالیں۔ دس بارہ برس کی عمر میں جب ہمجولی گلیوں گلیوں کھیلتے، بارش میں ننگ دھڑنگ "کوکلا چھپاکی جمعرات آئی جے" گاتے گنگناتے پھرتے، مَیں فرش پر نیم دراز، کسی کتاب کی بھول بھلیوں میں کھویا پڑا رہتا۔ نُقطہ نُقطہ سمیٹتا، حرف حرف چُنتا، سطر سطر چکھتا۔ ابتدائی تحیر کے دن اور کنواری حیرت کی شامیں تھیں۔ تجسس رگ رگ سے زم زم کے مانند پھوٹتا تھا۔ کیا سعدی و رومی، کیا حافظ و خیام، کیا میر و غالب، کیا فیض و فراز، سب آنکھوں کے رستے رگ و پے اور رگ و پے کی راہ سے روح میں محفوظ کر ڈالے۔ پھر اللہ ماری انگریزی کی لت پڑ گئی۔ ارے کچھ نہ پوچھو، شیکسپیئر اور بائرن سے لے کر کیٹس اور شیلے تک، ورڈز ورتھ اور کالرج سے لے کر ایڈگر ایلن پو اور ایملی برانٹے تک نگریا نگریا گھوما۔

سب میں تمہیں ڈھونڈا۔ سب میں تمہیں پایا۔

مولا ! غزلیں نظمیں دے:

مَیں سالہا سال چُپ رہا۔ سخن کی بانسری برسوں اپنے خالی پن میں سُروں کے امکانات بھرتی رہی، کسی خوش نفس کیفیت کا انتظار کرتی رہی کہ آئے اور اس خشک تار و خشک چوب و خشک پوست میں سانس سانس رُوح پھونک دے تاکہ آوازِ دوست برآمد ہو۔

اور پھر وہ دن آ گیا۔

آخر کار لاکھوں من وزنی خاموشی کی چٹان چیر کر سخن کی سبز کونپل مجھ میں سے پھوٹ پڑی۔ پہلا شعر تم پر کہا:

شیوۂ صبر ہم گنوا بیٹھے
آج اُسے حالِ دل سُنا بیٹھے

اور پھر دوسرا:

ہم سجاتے ہی رہ گئے گھر کو
آپ غیروں کے پاس جا بیٹھے

تب سے اب تک یہی زندگی ہے کہ غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں تمہیں۔ تم کہیں میری شہر بانو ہو، کہیں میری شاعری، کہیں میرے آنگن میں کھلی کلیوں میں دمکتی ہو، کہیں اُس گلِ سرخ و سفید میں چمکتی ہو جس کا مجھے انتظار ہے۔ اور جس کی آمد پر کامل اعتبار ہے۔

تمہاری تلاش قرنوں پر محیط کئی ادوار سے گزری ہے۔ صدیوں آس کے دھڑکتے انگار دہکائے تمہیں ڈھونڈا۔ کبھی کسی لاڈلے بچے کے مانند میر کی درویش انگلی تھامے، اُسی کے سچے سُچے سبز چوغے سے لٹکے گلیوں گلیوں تمہیں پکارتا پھرا، گاہے مرزا نوشہ کی مشکل پسندی اوڑھ کر تمہیں ڈھونڈا، کبھی فارسیت کے رُومی رنگ میں تمہاری یاد کو پُھسلایا تو کبھی ہندی بھاشا کے بھید بھاؤ دکھا کر تمہیں للچایا۔ گاہے فیض کے ساتھ پابجولاں بازاروں میں تمہیں تلاشا اور گاہے ناصر کے ساتھ دھیان کی سنسان ویران راتوں کے پورے چاند میں تمہارے نین نقش ڈھونڈے۔

پھر ایک روز کسی سخن سرائے میں عباس تابش اور شکیل جاذب سے ملنا ہوا۔

یوں لگا گویا میرا کنبہ مجھ سے آن ملا۔ تابش صاحب نے شعر سنانے کو کہا۔ سنائے تو جھٹ مان بھرے لہجے میں شکیل بھائی سے کہنے لگے: ''بھئی! اس لڑکے میں تو بہت دم اور امکان ہے۔ اسے ہمارا دوست ہونا چاہیے۔'' شکیل بھائی ہاں کہہ کر مسکرا دیئے۔ عباس تابش کے مان اور شکیل بھائی کی قبولیت کا قرض نہ مَیں آج تک چُکا پایا نہ آئندہ کبھی چُکا پاؤں گا۔

یہ دور شدید ریاضت کا دور تھا۔ تمہاری تلاش کا تحیر اور تجسس مجھے آسمانِ سخن میں ہر سو اُڑائے پھرتا تھا۔ ایسی آگ بھڑکتی اور ایسی حیرانی دھڑکتی تھی مجھ میں کہ خدا کی پناہ۔

مصرعوں، شعروں اور غزلوں پر گھنٹوں تابش صاحب سے گفتگو ہوتی، مَیں سیکھنے کی جستجو میں سوال پر سوال کرتا۔ اچھوتے نرالے انوکھے مضامین کے امکانات بسر کیے جاتے، مصرعے کے صوتی نظام سے لے کر غزالِ غزل کے خرام تک، مطلع کی اُٹھان سے مقطع کے بیان تک قدیم روایات اور جدید کیفیات کے تانے بانے جوڑے جاتے۔ عام باتوں کی اوٹ سے تام جھام ردیفوں کا نور ظہور کرتا۔ اسی سپیدۂ سحر میں مشقِ سخن آغاز ہوتی تو رات رہے تک رہتی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تحیر کے عہدِ اوّلیں میں تم مجھے بھیس بدل بدل کر ملا کرتی تھیں۔ پل دو پل قبل اُداسی بن کر رگ و پے میں رقص فرماتیں کہ چشم زدن میں اشک بن کر آنکھوں سے پھوٹ بہیں۔ کبھی وجد دھمال کی صورت تو کبھی حالتِ حال کی مورت۔ انہی بھرپور بھری پُری بیٹھکوں کے دوران مجھ انجان نے مصرعے کی بنت اور حال کی کیفیت کو باہم دگر گوندھنے اور ساختہ بے ساختگی تراشنے کا راز سیکھا۔ آج بھی اُس دور کی غزلیں میری دھڑکنوں کے آہنگ میں ہولے ہولے سانس لیتی ہیں۔

یو ای ٹی لاہور، پاکستان ایئر فورس اور سول سروس:

کیا کیا البیلے چمکیلے دور گزرے تمہاری کھوج میں، اللہ قسم۔ یو ای ٹی لاہور کے چٹخارے دار چنچل روز وشب پر دھیان دھرنے سے پاکستان ایئر فورس میں اُڑان بھرنے تک گام گام، بام بام ساتھ رہی ہو۔ مگر سچ کہوں تو تم عجیب پھسلواں ہمزاد ہو۔ ہر چند کہ مجھے تِل تِل یاد ہو مگر نظروں سے کہیں دُور آباد ہو۔ مانو کسی سفید ریشم کے گالے جیسے گول مٹول خرگوش کی طرح، پل میں ظاہر، پل میں اوجھل، ابھی رُوبرو ابھی اڑنچھو، پلک بھر جھلک، پھر غائب صدیوں تلک۔ اور مَیں عمر کے ہر دور میں تمہارا متلاشی۔

تم تو واقف ہو، کچھ ہی برسوں بعد مولائے کائنات نے ایسی چھاجوں عطا برسائی کہ تمہارا فارس پاکستان بھر کے لاکھوں کروڑوں ذہین فطین نوجوانوں میں سے چنیدہ ٹھہرا۔

مقابلے کے امتحان میں کامران اور افسری کے پُل صراط پر گامزن ہوا۔ مقابلے کا امتحان عشق کے امتحان سے ذرہ برابر کم نہیں۔ لیلائے سول سروس کے مجنوں لاکھوں ہیں۔ بیوروکریسی، افسرشاہی، سرکاری کرسی، یہ سب وہ خواہش وخواب وخیال ہیں جو ہمارے ہاں تقریباً ہرنوجوان کی آنکھ میں بستے ہیں۔ ہاں میری اذیت دوہری اور میری ابتلا دوچند ہے۔ یادتو کرو ذرا مرتضیٰ برلاس صاحب کو:

دوستوں کے حلقے میں ہم وہ کج مقدر ہیں
افسروں میں شاعر ہیں، شاعروں میں افسر ہیں

یقین جانو، میرے لیے عجیب حسبِ حال ہے یہ شعر۔ آج تک بھگت رہا ہوں۔

سخن کی جست:

گلی کی نکڑ پر ننھے مشاعروں سے دُنیا بھر کے گونجدار مشاعروں تک

دل میرا احسن کوزہ گر ہے اور اے میری جہاں زاد! دیکھو تو تم پر کہے گئے سخن پارے آج کیسے بنے ہیں جھلمل ستارے۔ کسی کم آباد قصبے کے ننھے منے مشاعرے سے لے کر امریکہ، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک، ہندوستان، چین، بنگلہ دیش اور کئی دیگر ملکوں کے مشاعروں تک، تمہارے فارس کو ڈھیروں ڈھیر محبتوں سے بلوایا، سنا، سراہا اور چاہا جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر دل پر سچی سُچی کیفیات کا در نہ بند ہو، اگر اشکوں کی زبانی دعائیں مانگنا آنکھوں کو پسند ہو تو بس ایک زقند میں سخن ساعتوں کی مقدس محرابوں، یادداشتوں کے قدیم گنبدوں اور دلوں کی خاموش بارگاہوں تک باریاب ہوجاتا ہے۔ دُنیا بھر میں۔

الحمد لِلہ کہ ربِ سخن نواز نے اوج عطا کی ہے سو اوج کی موج میں بہتا ہوں۔ فوج کی فوج ہے حاسدوں کی مگر پلٹ کر حرف بھر بھی نہیں کہتا ہوں۔ بس چپ چاپ اپنے سخن

میں مست رہتا ہوں۔ خدا لگتی کہو، یہی مناسب ہے نا؟ ورنہ حال یوں ہے کہ بے سبب ایک دُنیا خون کی پیاسی ہے۔ غضب خدا کا، افسری پر طنز، خدوخال کی رعنائی پر طعن، صنفِ نازک میں مقبولیت پر دُشنام۔ اور بھلا ان ناکاموں کو ہے کیا کام؟ سوان سب کو شاعر کا دُور ہی سے سلام۔

تم عشق ہو، مَیں خوب جانتا ہوں، تمہیں ہر رُوپ میں پہچانتا ہوں، رنگ بن کر آؤ کہ خوشبو، خواب بن کر آؤ کہ جادو۔ خوب خبر ہے مجھے کہ تم یہ لفظ پڑھ رہی ہو، دانتوں میں اُنگلی اور ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے۔

تمہی میری بھیرویں ہو اور کھماج، تمہی میر اکل ہو اور آج۔

تمہی میرا بنفشہ ہو اور گلاب، تمہی میرا دھوکہ ہو اور سراب۔

تمہی میری تازہ غزل اور نئی نظم ہو۔

تمہی میری شاعری ہو اور مجھ میں ایسے گتھ متھ گئی ہو کہ مَیں اب مَیں نہیں رہا، تم ہو گیا ہوں۔

تمہی رحمان فارس ہو اور تمہی رحمان فارس کی محبوب و مطلوب و مدعا۔

اپنی تمام تر معصوم بے نیازیوں، شریر کج ادائیوں اور مسلسل بے مہریوں کے ساتھ شادو شاداب رہو۔

کیونکہ تم ہو تو میری شاعری ہے اور میری شاعری ہے تو مَیں ہوں۔

رحمان فارس

آخری پہر، شبِ دُعا

لاہور

○

جان سے جاؤں تو ہونٹوں پہ ثنا ہو، آمین
آخری نعت مدینے میں عطا ہو، آمین

پھڑپھڑا کر مرے سینے سے نکل جائے دِل
یہ کبوتر اُسی روضے پہ رہا ہو، آمین

میرے آنگن میں کھلیں آپؐ کی سیرت کے گلاب
میرا گھر آپؐ کی خوشبو میں بسا ہو، آمین

حاضری اور حضوری میں مرے ماتھے کا نُور
نبیؐ پاکؐ کا نقشِ کفِ پا ہو، آمین

میری بستی سے اندھیروں کے یہ بادل چھٹ جائیں
ہر طرف روشنئ صلِ علیٰ ہو، آمین

چشمۂ چشم کا پانی اسے سیراب کرے
نخلِ مدحت کو مَیں جب دیکھوں ، ہرا ہو، آمین

حرف کے پھول کھلانے کا مجھے فن مِل جائے
اور اس فن کو کبھی بھی نہ فنا ہو، آمین

بات بن جائے کسی طور، مری نعت کی بات
لفظ کم بھی ہوں تو اشکوں سے ادا ہو، آمین

غزل بہانہ کروں

○

صدائیں دیتے ہوئے اور خاک اُڑاتے ہوئے
مَیں اپنے آپ سے گزرا ہوں تجھ تک آتے ہوئے

پھر اُس کے بعد زمانے نے مجھ کو روند دیا
مَیں گر پڑا تھا کسی اور کو اُٹھاتے ہوئے

کہانی ختم ہوئی اور ایسے ختم ہوئی
کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

تُمہاری راہ میں بیٹھا صدائیں دیتا ہوں
بس اِک نگاہ مری جان ! آتے جاتے ہوئے

پھر اُس کے بعد عطا ہوگئی مجھے تاثیر
مَیں رو پڑا تھا کسی کو غزل سُناتے ہوئے

زمانہ تو ہے ازل سے ستم شعار مگر
تجھے بھی رحم نہ آیا مجھے ستاتے ہوئے ؟

خریدنا ہے تو دِل کو خرید لے فوراً
کھلونے ٹوٹ بھی جاتے ہیں آزماتے ہوئے

اگر مِلے بھی تو مِلتا ہے راہ میں فارس
کہیں سے آتے ہوئے یا کہیں کو جاتے ہوئے

○

بیٹھے ہیں چَین سے، کہیں جانا تو ہے نہیں
ہم بے گھروں کا کوئی ٹھکانا تو ہے نہیں

تُم بھی ہو بیتے وقت کے مانند ہُو بہُو
تُم نے بھی یاد آنا ہے، آنا تو ہے نہیں

عہدِ وفا سے کس لیے خائف ہو، میری جان!
کرلو کہ تُم نے عہد نبھانا تو ہے نہیں

وہ جو ہمیں عزیز ہے، کیسا ہے، کون ہے
کیوں پُوچھتے ہو، ہم نے بتانا تو ہے نہیں

دُنیا! ہم اہلِ عشق ہیں، کیوں پھینکتی ہے جال
ہم نے ترے فریب میں آنا تو ہے نہیں

کوشش کریں تو لوٹ ہی آئے گا ایک دِن
وہ آدمی ہے، گزرا زمانہ تو ہے نہیں

وہ عشق تو کرے گا مگر دیکھ بھال کے
فارس وہ تیرے جیسا دِوانہ تو ہے نہیں

○

معلوم ہے جناب کا مطلب کچھ اَور ہے
میری لُغت میں آپ کا مطلب کچھ اَور ہے

تُو نے بہت خراب کیا ہے مجھے مگر
اِس شعر میں خراب کا مطلب کچھ اَور ہے

یہ عارضی طلب ہے، اِسے عشق مت سمجھ
لمحاتی اضطراب کا مطلب کچھ اَور ہے

صحرا نے کر تو دی ہے مجھے گھر کی پیش کش
اِس خانماں خراب کا مطلب کچھ اَور ہے

تسلیم ہے کہ مَیں نے دیا ہے اُسے گلاب
لیکن یہاں گلاب کا مطلب کچھ اَور ہے

تعبیر زندگی ہی بتائی گئی مجھے
حالانکہ میرے خواب کا مطلب کچھ اَور ہے

صحرا کے ہاں بھنور کے معانی ہیں مختلف
دریا کے ہاں سراب کا مطلب کچھ اَور ہے

فرہنگِ عشق دیکھ کے آیا ہوں مَیں ابھی
اُس میں گنہ ثواب کا مطلب کچھ اَور ہے

اِس فتنہ گر ہجوم کو سمجھایئے، جناب!
قوموں میں انقلاب کا مطلب کچھ اَور ہے

سچ ہے کہ ماہتاب سے کرتا ہوں عشق مَیں
ہاں لفظِ ماہتاب کا مطلب کچھ اَور ہے

گو وصل کے سوال پہ انکار ہو گیا
خوش ہوں کہ اِس جواب کا مطلب کچھ اَور ہے

ہوتی ہے اَور طرح غریبوں کی چھان بین
شاہوں کے احتساب کا مطلب کچھ اَور ہے

ناراض عشق ! حُسن کی مجبوریاں سمجھ
محفل میں اجتناب کا مطلب کچھ اَور ہے

ساقی کی پیش کش نہیں محدود جام تک
اِس دعوتِ شراب کا مطلب کچھ اَور ہے

مقصد فقط چھپانا نہیں خدّوخال کو
فارس میاں! حجاب کا مطلب کچھ اَور ہے

○

خاک اُڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں

مجھ کو خود میں جگہ نہیں مِلتی
تُو ہے موجود اِس قدر مجھ میں

بے گھری اب مرا مقدر ہے
عشق نے کرلیا ہے گھر مجھ میں

موسمِ گریہ ! اک گذارش ہے
غم کے پکنے تلک ٹھہر مجھ میں

صرف ماں کی دُعا سے کام بنا
ورنہ کب تھا کوئی ہُنر مجھ میں

حوصلہ ہو تو بات بن جائے
حوصلہ ہی نہیں مگر مجھ میں

آنکھ سوتی ہے، خواب جاگتے ہیں
کہیں شب ہے، کہیں سحر مجھ میں

آپ کا دھیان خون کے مانند
دوڑتا ہے اِدھر اُدھر مجھ میں

O

جب خزاں آئے تو پتے نہ ثمر بچتا ہے
خالی جھولی لیے ویران شجر بچتا ہے

نکتہ چیں! شوق سے دِن رات مرے عیب نکال
کیونکہ جب عیب نکل جائیں، ہنر بچتا ہے

سارے ڈر بس اسی ڈر سے ہیں کہ کھو جائے نہ یار
یار کھو جائے تو پھر کونسا ڈر بچتا ہے

غم وہ رستہ ہے کہ شب بھر اِسے طے کرنے کے بعد
صبح دم دیکھیں تو اُتنا ہی سفر بچتا ہے

روز پتھراؤ بہت کرتے ہیں دنیا والے
روز مر مر کے مرا خواب نگر بچتا ہے

بس یہی سوچ کے آیا ہوں تری چوکھٹ پر
دربدر ہونے کے بعد اِک یہی در بچتا ہے

اب مرے عیب زدہ شہر کے شر سے، صاحب!
شاذ و نادر ہی کوئی اہلِ ہنر بچتا ہے

عشق وہ علمِ ریاضی ہے کہ جس میں فارس
دو سے جب ایک نکالیں تو صفر بچتا ہے

○

خوشبوئے گُل نظر پڑے، رقصِ صبا دکھائی دے
دیکھا تو ہے کسی طرف، دیکھیے کیا دکھائی دے

تب مَیں کہوں کہ آنکھ نے دید کا حق ادا کیا
جب وہ جمالِ کم نما دیکھے بِنا دکھائی دے

دیکھے ہوؤں کو بار بار دیکھ کے تھک گیا ہوں مَیں
اب نہ مجھے کہیں کوئی دیکھا ہوا دکھائی دے

ایک سوال، اک جواب، پھر نہ رہا کوئی حجاب
اُس نے کہا دکھائی دوں؟ مَیں نے کہا دکھائی دے

کیا یہ وفورِ شوق ہے یا یہ فریبِ عشق ہے؟
دیکھوں مَیں جب بھی آئنہ، چہرہ ترا دکھائی دے

چھوڑ یہ پردہ داریاں، آنکھ مچولی ترک کر
اے مرے یار ! اب مجھے دیکھ لے یا دکھائی دے

آیتِ حُسن کی قسم، کفر نہیں یہ عشق ہے
پیکرِ خاک میں اگر نورِ خدا دکھائی دے

لگتے ہیں اُس کے خدوخال، تازہ انوکھے لازوال
جتنا پرانا ہے وہ شخص، اُتنا نیا دکھائی دے

حسن کے در سے دم بدم، بھیک ملے بصد کرم
فارسِ کم نگاہ کو روپ ترا دکھائی دے

O

آپ کی آنکھیں اگر شعر سنانے لگ جائیں
ہم جو غزلیں لیے پھرتے ہیں ٹھکانے لگ جائیں

ہم اگر روز بھی اک یاد بُھلانے لگ جائیں
تیری یادوں کو بُھلانے میں زمانے لگ جائیں

ہم تہی ظرف نہیں ہیں کہ محبت کر کے
کسی احسان کے مانند جتانے لگ جائیں

ہائے بے چارگیٔ عشق کہ وہ پتھر دل
ٹھوکریں مارے تو ہم پاؤں دبانے لگ جائیں

سُست اتنا ہُوں کہ بِن تیر چلائے چاہُوں
کہ مرے تیر پہ خود آ کے نشانے لگ جائیں

○

سکوتِ شام میں گونجی صدا اُداسی کی
کہ ہے مزید اُداسی دوا اُداسی کی

بہت شریر تھا مَیں اور ہنستا پھرتا تھا
پھر اک فقیر نے دے دی دُعا اُداسی کی

امورِ دل میں کسی تیسرے کا دخل نہیں
یہاں فقط تری چلتی ہے یا اُداسی کی

چراغِ دل کو ذرا احتیاط سے رکھنا
کہ آج شام چلے گی ہوا اُداسی کی

وہ امتزاج تھا ایسا کہ دنگ تھی ہر آنکھ
جمالِ یار نے پہنی قبا اُداسی کی

اِسی اُمید پہ آنکھیں برستی رہتی ہیں
کہ ایک دن تو سُنے گا خُدا اُداسی کی

شجر نے پُوچھا کہ تجھ میں یہ کس کی خوشبو ہے
ہوائے دشتِ جنوں نے کہا اُداسی کی

بہت دنوں سے مَیں اُس سے نہیں مِلا فارس
کہیں سے خیر خبر لے کے آ اُداسی کی

○

گرچہ کم کم تری تصویر نظر آتی ہے
سات رنگوں کی صدا آٹھ پہر آتی ہے

شاعری نامی پرندے کے ذریعے مجھ تک
کتنے نادیدہ زمانوں کی خبر آتی ہے

حیرتی ہوں کہ گلی والے گُلوں کی خوشبو
کیسے در کھولے بِنا صحن میں در آتی ہے

کون فنکار سنبھالے وہاں مصرعے کی لچک
قافیہ بن کے جہاں تیری کمر آتی ہے

فیصلہ کر لے کہ ہے کون زیادہ حساس
تجھ کو آتی ہے مہک، مجھ کو نظر آتی ہے

شعر تو بعد میں ہم سنتے سناتے رہیں گے
پہلے بتلا تجھے تعظیمِ ہنر آتی ہے؟

اور کیا آئے گا ہم اہلِ محبت پہ عذاب؟
ہاں، قیامت ہے سو آنے دو اگر آتی ہے

راستہ لاکھ مقفّل ہو گلے سے لب تک
چیخ تو چیخ ہے، چپکے سے گزر آتی ہے

زندگی بھی ہے بڑی ڈھیٹ سی اک محبوبہ
چھوڑ جائے تو کہاں بارِ دگر آتی ہے

ایسا خودکار ہے فارس مِرے اشکوں کا نظام
خالی ہوتی ہے مری آنکھ تو بھر آتی ہے

○

یہ جو مجھ پر نکھار ہے سائیں
آپ ہی کی بہار ہے سائیں

آپ چاہیں تو جان بھی لے لیں
آپ کو اختیار ہے سائیں

تم مِلاتے ہو بچھڑے لوگوں کو
ایک میرا بھی یار ہے سائیں

روز آنسو کما کے لاتا ہوں
غم مرا روزگار ہے سائیں

کسی کھونٹے سے باندھ دیجے اِسے
دِل بڑا بے مہار ہے سائیں

عشق میں لغزشوں پہ کیجے معاف
سائیں! یہ پہلی بار ہے سائیں

گُل مِلا کر ہے جو بھی کچھ میرا
آپ سے مستعار ہے سائیں

ایک کشتی بنا ہی دیجے مجھے
کوئی دریا کے پار ہے سائیں

وسعتِ رزق کی دعا دیجے
درد کا کاروبار ہے، سائیں

خارزاروں سے ہو کے آیا ہوں
پیرہن تار تار ہے سائیں

کبھی آ کر تو دیکھیے کہ یہ دل
کیسا اجڑا دیار ہے سائیں

○

یہ غم نہیں کہ وہ مجھ سے وفا نہیں کرتا
ستم تو یہ ہے کہ کہتا ہے جا، نہیں کرتا

طلوعِ عارض و لب تک مَیں صبر کرتا ہوں
سو مُنہ اندھیرے غزل ابتدا نہیں کرتا

یہ شہر ایسے حریصوں کا شہر ہے کہ یہاں
فقیر بھیک لیے بِن دعا نہیں کرتا

زباں کا تلخ ہے لیکن وہ دِل کا اچھا ہے
سو اس کی بات پہ مَیں دل بُرا نہیں کرتا

شہیدِ عشق کی سرشاریاں ملاحظہ ہوں
گلا کٹا کے بھی خوش ہے، گِلہ نہیں کرتا

سوالِ عشق پہ لمبی کہانیاں نہ سُنا
مجھے بتا کہ تُو کرتا ہے یا نہیں کرتا؟

بس ایک مصرعۂ تر کی تلاش ہے مجھ کو
مَیں سعیٔ چشمۂ آبِ بقا نہیں کرتا

مجھے قبول نہیں خیر و شر کی یہ پہچان
کہ وہ بُرا ہے جو میرا بھلا نہیں کرتا

دل ایسا پھول ہے فارس کہ جو مہکنے کو
ذرا بھی منّتِ بادِ صبا نہیں کرتا

○

حرف در حرف اک دُعا ترا نام
عشق کا پہلا معجزہ ترا نام

نارسائی کے عرش سے اُتر آ
ورنہ رکھ دیں گے ہم خدا ترا نام

صدیوں سوچی حروف نے ترتیب
تب کہیں لفظ میں ڈھلا ترا نام

قسمیں دے دے کے پوچھتے رہے لوگ
مَیں نے پھر بھی نہیں لیا ترا نام

مِٹ نہ پائے گا وقت کے ہاتھوں
لوحِ دل پر لکھا ہوا ترا نام

ساری یادوں سے دِل نشیں تری یاد
سارے ناموں سے دِلرُبا ترا نام

دھیان کی خواب ناک وادی میں
رات بھر گونجتا رہا ترا نام

O

جہان بھر میں کسی چیز کو دوام ہے کیا؟
اگر نہیں ہے تو سب کچھ خیالِ خام ہے کیا؟

اُداسیاں چلی آتی ہیں شام ڈھلتے ہی
ہمارا دل کوئی تفریح کا مقام ہے کیا؟

وہی ہو تم جو بُلانے پہ بھی نہ آتے تھے
بِنا بُلائے چلے آئے ، کوئی کام ہے کیا؟

جواباً آئی بڑی تیز سی مہک منہ سے
سوال یہ تھا کہ مولانا ! مے حرام ہے کیا؟

بتا رہے ہو کہ رسمی دعا سلام ہے بس
دعا سلام کا مطلب دعا سلام ہے کیا؟

تو کیا وہاں سے بھی اب ہر کوئی گزرتا ہے؟
وہ راہِ خاص بھی اب شاہراہِ عام ہے کیا؟

مَیں پوچھ بیٹھا تمہیں یاد ہے ہمارا عشق؟
جواب آیا کہ تُو کون؟ تیرا نام ہے کیا؟

اِک ایک کر کے سبھی یار اُٹھتے جاتے ہیں
درونِ خانہ کوئی اور انتظام ہے کیا؟

بَری کرانا ہے ابلیس کو کسی صورت
خدا کے گھر میں کسی سے دعا سلام ہے کیا؟

جواب آیا کہ فَرفَر سناؤں ؟ یاد ہے سب
سوال یہ تھا کہ یہ آپ کا کلام ہے کیا؟

تُو بے وفائی کرے اور پھر یہ حکم بھی دے
کہ بس ترا رہے فارس، ترا غلام ہے کیا؟

○

کوئی نہیں ہے یہاں جیسا خوبرُو تُو ہے
حسیں بہت ہیں مگر میرے یار ! تُو تُو ہے

وہ روشنی تھی کہ آنکھیں تو اُٹھ نہیں پائیں
مَیں تیرے پاؤں سے جانا کہ رُوبرو تُو ہے

یہ اور بات کہ پھر سلسلہ ہی چل نکلا
خُدا گواہ، مری پہلی آرزُو تُو ہے

ترے کرم سے مرے اشک معتبر ٹھہرے
بچھڑنے والے ! مرے غم کی آبرُو تُو ہے

ترے ہی لُطف سے رہتے ہیں میرے زخم ہرے
سو نخلِ غم کے لیے باعثِ نمُو تُو ہے

تُو شش جہات میں ہے اور مرے وجود میں بھی
نہیں ہے یُوں کہ فقط میرے چار سُو تُو ہے

گروہِ گُل بدَناں ہو کہ محفلِ عُشّاق
تمام شہر کا موضوعِ گفتگو تُو ہے

○

خلقتِ شہر بھلے لاکھ دُہائی دیوے
قصرِ شاہی کو دکھائی نہ سنائی دیوے

عشق وہ ساتویں حس ہے کہ عطا ہو جس کو
رنگ سُن جاویں اُسے، خوشبو دکھائی دیوے

ایک تہ خانہ ہوں مَیں اور مرا دروازہ ہے تُو
جُز ترے کون مجھے مجھ میں رسائی دیوے

ہم کسی اور کے ہاتھوں سے نہ ہوں گے گھائل
زخم دیوے تو وہی دستِ حنائی دیوے

تُو اگر جھانکے تو مجھ اندھے کنویں میں شاید
کوئی لَو اُبھرے، کوئی نقش سجھائی دیوے

پتّیاں ہیں، یہ سلاخیں تو نہیں ہیں فارس
پھول سے کہہ دو کہ خوشبو کو رہائی دیوے

O

الماری میں سوکھے پھول نظر آئے
کتنے بیتے موسم دھیان میں در آئے

ایک لطیفے سے کل یاد آیا کوئی
ہنستے ہنستے آنکھ میں آنسو بھر آئے

ضبط کی بھٹی میں یوں پک گئے اشک مرے
چھانی آنکھ تو مٹھی میں کنکر آئے

اِس حالت کو اُردو میں کیا کہتے ہیں؟
جب دِل کے خالی پن سے دِل بھر آئے

آ کر مِل جا ورنہ یہ بھی ممکن ہے
تُو خوش خوش بیٹھا ہو اور خبر آئے

جاتے جاتے ایک دُعا تو لیتا جا
جا تیرا دل تیرے جیسے پر آئے

شور مچاتی رہی وہ آنکھ کہ رُک جاؤ
لیکن اب کے ہم چپ چاپ گذر آئے

جان بچی سو لاکھوں پائے فارس نے
عشق گلی سے لوٹ کے بدھو گھر آئے

O

نظر اُٹھائیں تو کیا کیا فسانہ بنتا ہے
سو پیشِ یار نگاہیں جھکانا بنتا ہے

وہ لاکھ بے خبر و بے وفا سہی لیکن
طلب کِیا ہے گر اُس نے تو جانا بنتا ہے

قدم قدم پہ توازن کی بات مت کیجے
یہ مَے کدہ ہے، یہاں لڑکھڑانا بنتا ہے

بچھڑنے والے! تجھے کس طرح بتاؤں مَیں؟
کہ یاد آنا نہیں، تیرا آنا بنتا ہے

رگوں تلک اُتر آئی ہے ظلمتِ شب غم
سو اب چراغ نہیں، دِل جلانا بنتا ہے

پرائی آگ مرا گھر جلا رہی ہے سو اب
خموش رہنا نہیں، غُل مچانا بنتا ہے

پھر اُس کے بعد تو بالکل دھڑک نہیں پاتا
وہ دل جو تیری نظر کا نشانہ بنتا ہے

یہ دیکھ کر کہ ترے عاشقوں میں مَیں بھی ہوں
جمالِ یار ! ترا مسکرانا بنتا ہے

جنوں بھی صرف دکھاوا ہے، وحشتیں بھی غلط
دوانہ ہے نہیں فارس، دوانہ بنتا ہے

○

یاد رکھ ، خود کو مٹائے گا تو چھا جائے گا
عشق میں عجز مِلائے گا تو چھا جائے گا

اچھی آنکھوں کے پجاری ہیں مرے شہر کے لوگ
تُو مرے شہر میں آئے گا تو چھا جائے گا

ہم قیامت بھی اُٹھائیں گے تو ہوگا نہیں کچھ
تُو فقط آنکھ اُٹھائے گا تو چھا جائے گا

پھول تو پھول ہیں ، وہ شخص اگر کانٹے بھی
اپنے بالوں میں سجائے گا تو چھا جائے گا

پنکھڑی ہونٹ ، مدھر لہجہ اور آواز اُداس
یار ! تُو شعر سنائے گا تو چھا جائے گا

جس مصور کی نہیں بکتی کوئی بھی تصویر
تیری تصویر بنائے گا تو چھا جائے گا

تجھ پہ ہر رنگ ہی سجتا ہے برابر لیکن
سُرخ پوشاک میں آئے گا تو چھا جائے گا

بات سے بات نکالے گا تو ہونگے نہیں شعر
ذات سے بات بنائے گا تو چھا جائے گا

○

سجا کے چہرے پہ بیگانگی نہیں مِلنا
مجھے مِلو تو کبھی سرسری نہیں مِلنا

ہمارے جیسے تو مِل جائیں گے ہزاروں تمہیں
تمہارے جیسا ہمیں ایک بھی نہیں مِلنا

یہی سبق ہے محبت کا اوّل و آخر
جسے تلاش کرو گے وہی نہیں مِلنا

وہ جا رہا ہے سو جی بھر کے دیکھ لو فارس
پھر اِس کے بعد یہ موقع کبھی نہیں مِلنا

○

لعل و گہر کہاں ہیں، دفینوں سے پوچھ لو
سینوں میں کافی راز ہیں، سینوں سے پوچھ لو

جھیلا ہے مَیں نے تین سو پینسٹھ دکھوں کا سال
چاہو تو پچھلے بارہ مہینوں سے پوچھ لو

قبروں کے دُکھ سے کم نہیں کچے گھروں کے دُکھ
تُم زندہ لاشوں یعنی مکینوں سے پوچھ لو

چوتھا گواہ اندھا ہے، حد کس طرح لگے؟
عینی گواہ تین ہیں، تینوں سے پوچھ لو

مَیں جونہی بوئے بیج، شجر پھوٹنے لگے
مجھ پر یقیں نہیں تو زمینوں سے پوچھ لو

ایک آدھ تو کرے گی ہی اقرار لازماً
دو تین چار پانچ حسینوں سے پوچھ لو

سمجھو گے دل کی رمز مُجھی سے مگر ابھی
تُم شوق پورا کر لو، ذہینوں سے پوچھ لو

چھن جائے گھر تو کیسے رُلاتی ہے بے گھری
ٹوٹی انگوٹھیوں کے نگینوں سے پوچھ لو

سچ سچ بتائیں گے وہ تمہیں ڈوبنے کا لطف
دریا کی تہ میں غرق سفینوں سے پوچھ لو

اپنے گُرو کے طور پہ لیں گے سب ایک نام
تُم شہر بھر کے سارے کمینوں سے پوچھ لو

نیچے اترتے وقت اُسے موچ آگئی
آگے کا سارا واقعہ زینوں سے پوچھ لو

پوچھو نہ سجدہ گاہ سے سجدوں کی چاشنی
ہاں پوچھنا ہی ہے تو جبینوں سے پوچھ لو

ڈستے ہیں کس ترنگ میں، پھنکارتے ہیں کیوں
سانپوں کی نفسیات خزینوں سے پوچھ لو

جو بات اہلِ عرش بھی بتلا نہیں سکے
فارس ! وہ بات خاک نشینوں سے پوچھ لو

○

ہر چیز مشترک تھی ہماری سوائے نام
اور آج رہ گیا ہے تعلق برائے نام

اشیائے کائنات سے ناآشنا تھا مَیں
پھر ایک اسم نے مجھے سب کے سکھائے نام

تب مَیں کہوں کہ سچا ہوں یک طرفہ عشق میں
وہ میرا نام پوچھے، مجھے بھول جائے نام

وہ دلرُبا بھی تھی کسی شاعر کی کھوج میں
مَیں نے بھی پھر بتایا تخلص بجائے نام

لشکر بنا رہا ہوں جوانانِ عشق کا
جس میں بھی آگ ہے، مجھے مِل کر لکھائے نام

تُو عشق پائے عشق کے مرنے کے بعد بھی
فارس! مزارِ دل پہ ترا جگمگائے نام

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

تُو رنگ برنگی روشنی، ترا کومل رُوپ سروپ

تُو رنگ برنگی روشنی، ترا کومل رُوپ سروپ
تُو چھیل چھبیلی چھاؤں ہے، تُو نئی نویلی دھوپ
گُل پھول، ستارے، تتلیاں، ترے حسن کے ہیں بہروپ
من موجی الہڑپن ترا، حیران کنوارا روپ

انسان جھکیں تعظیم کو تری جدھر سواری جائے
تجھے دیکھ فرشتے مست ہوں، خود خدا بھی واری جائے

ترے بول تھرکتی راگنی، ترے گال گُلوں کے تاج
تری آنکھ ستارہ صبح کا، تری کمر ندی کی لاج
لب سرخ سجیلی پنکھڑی، ہر باغ پہ تیرا راج
ہر دِل ہے تیری سلطنت، تُو کرے وصول خراج

اُس راہ پہ چمکیں خوشبوئیں جسے چھولے پاؤں ترا
تُو آسمان کی اپسرا اور عرش پہ گاؤں ترا

برپا تھا اِک دن باغ میں ترے نینوں کا دربار
سَو لاکھ رعایا تتلیاں، گل پھول غلام ہزار
مَیں آخر صف میں آخری تھا مست دمِ دیدار
یک لخت ہوا تری آنکھ کا کجرارا کاری وار

صد شکر کہ تب سے دل مرا سردار ہے زخموں کا
مرا سینہ سینہ تو نہیں، شہکار ہے زخموں کا

ترے نرم الوہی حُسن کی سو سو آیات دلیل
قرآن کی کھاتے ہیں قسم، توریت، زبور، انجیل
تُو ٹھنڈا زم زم نیلگوں، ترا جسم انوکھی جھیل
تُو آنکھوں سے جب حکم دے، ہر شخص کرے تعمیل

ترے انگ انگ میں روشنی ان گنت دعاؤں کی
تُو دیوتاؤں کی لاڈلی، تُو جان خداؤں کی

اے مست مُدھر من موہنی ! مجھے روپ کی دے خیرات
اے پاک سہانی سوہنی ! ہُوں خشک، چھڑک برسات
اے مَن معبد کی راہبہ ! چل تھام لے میرا ہاتھ
ان چھوئی مقدس صاحبہ ! آ لمس کا چرخہ کات

ہم ازل ابد کے گھاٹ پر یُوں عشق میں تر ہو جائیں
تیرے اور میرے نام کے سب حرف امر ہو جائیں

دِل جلتا ہے

جب جانا پہچانا موسم
اِک آن میں رنگ بدلتا ہے
ان گنت زمانوں سے جاری
کسی ربط کی سانسیں ٹوٹتی ہیں
جب ترکِ تعلق کے طوفان میں
چاہت کی کومل کونپل
یک لخت بکھرنے لگتی ہے
جب وقت کے آنگن میں رقصاں
کسی عشق کی خوشبو تھک کر مرنے لگتی ہے
جب دور اُفق پر یاد کا سورج ڈھلتا ہے
رگ رگ سے درد اُبلتا ہے
دل جلتا ہے

شہر بانو کے لیے ایک نظم

تمھیں جب دیکھتا ہوں
تو مری آنکھوں پہ رنگوں کی پھواریں پڑنے لگتی ہیں
تمھیں سُنتا ہوں
تو مجھ کو قدیمی مندروں سے گھنٹیوں اور مسجدوں سے ورد کی آواز آتی ہے
تمہارا نام لیتا ہوں
تو صدیوں قبل کے لاکھوں صحیفوں کے مقدس لفظ میرا ساتھ دیتے ہیں
تمھیں چُھولوں
تو دُنیا بھر کے ریشم کا ملائم پن مری پوروں کو آ کر گدگداتا ہے
تمھیں گر چوم لُوں
تو میرے ہونٹوں پر الوہی، آسمانی، ناچشیدہ ذائقے یوں پھیل جاتے ہیں
کہ اُس کے بعد مجھ کو شہد بھی پھیکا سا لگتا ہے
تمھیں جب یاد کرتا ہوں

تو ہر ہر یاد کے صدقے مَیں اشکوں کے پرندے چوم کر آزاد کرتا ہوں

تمہارے اور اپنے عشق کی ہر کیفیت سے آشنا ہوں مَیں
مگر جاناں!
تمہیں بالکل بُھلا دینے کی جانے کیفیت کیا ہے؟
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ مرگِ ذات کے احساس سے بھر جاؤں گا فوراً
تمہیں مَیں بُھولنا چاہوں گا تو مر جاؤں گا فوراً

Euphoria

تمہاری یاد کی خوشبو لگائی تھی مَیں نے
تمام رات مرے جسم و جاں مہکتے رہے
سرورِ ہجر کے موسم میں بھی نہ ماند پڑا
حواس ضبط کے عالم میں بھی بہکتے رہے
دیارِ خواب میں کچھ طائرانِ خوش آواز
تمہارے آنے کی اُمید میں چہکتے رہے
نواحِ دل میں کئی روشنی بھرے سائے
وفورِ شوق سے گاتے رہے ، لہکتے رہے

مَیں تُم سے دُور تھا، لیکن تُمہارے ہاتھ میں تھا
گذشتہ شب مَیں کسی اور کائنات میں تھا

Selfie

ہجر کے بے صدا جزیرے پر
کنجِ تنہائی میں کوئی لڑکی
خال و خد پر لگا کے آس کا رنگ
چشم ولب پر سجا کے دل کی امنگ
آنکھوں آنکھوں میں مسکراتی ہے
شام کی سرمئی اداسی میں
اپنی تصویر خود بناتی ہے

ادھ کھلے ہونٹ، نیم وا آنکھیں
بےنوا ہونٹ، بےصدا آنکھیں
ایسی خاموشی، ایسی تنہائی
خود تماشا ہے خود تماشائی
خود ہی تصویر، خود مصور ہے
خود غزل اور خود ہی شاعر ہے

سوچتی ہے کہ جس کے ہجر میں مَیں
شمع سی صبح و شام جلتی ہوں
موم سی رات دن پگھلتی ہوں
کاش وہ میری روشنی دیکھے
میری آنکھوں کی اَن کہی سمجھے
میرے تن من کی بے بسی دیکھے
جتنی شدت سے خود کو دیکھتی ہوں
کاش وہ بھی مجھے کبھی دیکھے

کس قدر مصروفیت ہے

کس قدر مصروفیت ہے، الحذر
کس قدر مصروفیت ہے، الاماں
ساعتیں ہیں وقت کے منہ زور گھوڑے پر سوار
اُڑتی جاتی ہیں غضب رفتار سے
کام دھندے ان گنت ہیں، مسئلے ہیں بے شمار
کوئی لمحہ بھی خیالِ یار کا لمحہ نہیں

ہو گیا ہے زندگی کی جھیل سے ٹھہراؤ گُم
وصل تو کیا، وصل کی خواہش کی بھی فرصت نہیں
حشر ایسا ہے کہ مٹھی بھر سکوں مِلتا نہیں

روز ہی مَیں سوچتا ہوں
آج کے دِن سب ادھورے کام نمٹا لوں گا مَیں

اپنی خواہش کے مُطابق وقت کو ڈھالوں گا مَیں
خُود سے پیچھے رہ گیا ہوں، آج اپنے آپ کو جا لُوں گا مَیں

کل سے روزانہ گلوں سے گفتگو ہو گی مری
سارے رُوٹھے موسموں کو چائے پر بُلواؤں گا
حلقۂ احباب یعنی سب پرندوں کو منا کر لاؤں گا

سب کروں گا، خُود سے وعدہ ہے مرا
سب کروں گا لیکن اے میرے تھکے ہارے بدن!
آج کے دِن سب ادھورے کام نمٹانے کے بعد
آج کے دِن زندگی کو وقت پر لانے کے بعد

فیکون

فقط خلا تھا
نہیں، خلا بھی کہیں نہیں تھا
عدم کدے میں نہ تھے زمان و مکاں کہیں بھی
عدم کدہ بھی کہیں نہیں تھا
نہ وقت تھا اور نہ رنگ و بو تھے
نہ تحت و بالا نہ چار سُو تھے
وجود معدوم، ہست کا ہر نشاں ندارد
زمیں سرے سے نہیں تھی اور آسماں ندارد
نہ روح کی لَے، نہ سانس کی دُھن
نہ جاں کی آہٹ، نہ دِل کی سُن گُن
پھر ایک آواز گونج اُٹھی، کُن!

غزل اُس نے چھیڑی

○

چاند آ بیٹھا ہے پہلو میں، ستارو ! تخلیہ
اب ہمیں درکار ہے خلوت، سو یارو ! تخلیہ

دیکھنے والا تھا منظر جب کہا درویش نے
کج کلاہو ! بادشاہو ! تاجدارو ! تخلیہ

آنکھ وا ہے اور حُسنِ یار ہے پیشِ نظر
شش جہت کے باقی ماندہ سب نظارو ! تخلیہ

غم سے اب ہوگی براہِ راست میری گفتگو
دوستو ! تیمار دارو ! غمگسارو ! تخلیہ

چاروں جانب ہے ہجومِ ناشنایانِ سخن
آج پورے زور سے فارس پکارو تخلیہ

○

خوشی سمیٹ کے رکھ اور غم سنبھال کے رکھ
ہُوا ہے عشق میں جو کچھ بہم، سنبھال کے رکھ

یہ قیمتی ہیں، اِنہیں یُوں نہ بے دریغ لُٹا
اِن آنسوؤں کو سرِ چشمِ نم سنبھال کے رکھ

ہمیں تو خیر گنوا ہی دِیا ہے تُو نے مگر
ہماری یاد کو تو کم سے کم سنبھال کے رکھ

یہ دور عرضِ سُخن کا نہیں، سکوت کا ہے
ابھی اثاثۂ لوح و قلم سنبھال کے رکھ

یہاں کی خاک بھی حقدار احترام کی ہے
دیارِ عشق میں فارس قدم سنبھال کے رکھ

○

زباں پر مصلحت، دِل ڈرنے والا
بڑا آیا محبت کرنے والا

شکستہ پیڑ پر چڑیوں کے نوحے
خُدا بخشے، بھلا تھا مرنے والا

ترے دِل میں بھی اِک دِن جا بسے گا
ترے پیروں پہ ماتھا دھرنے والا

○

سربسر یار کی مرضی پہ فدا ہو جانا
کیا غضب کام ہے راضی بہ رضا ہو جانا

بند آنکھو ! وہ چلے آئیں تو وا ہو جانا
اور یوں پھوٹ کے رونا کہ فنا ہو جانا

عشق میں کام نہیں زور زبردستی کا
جب بھی تم چاہو جدا ہونا، جدا ہو جانا

تیری جانب ہے بتدریج ترقی میری
میرے ہونے کی ہے معراج ترا ہو جانا

تیرے آنے کی بشارت کے سوا کچھ بھی نہیں
باغ میں سوکھے درختوں کا ہرا ہو جانا

تنگ آ جاؤں محبت سے تو گاہے گاہے
اچھا لگتا ہے مجھے تیرا خفا ہو جانا

سی دیے جائیں مرے ہونٹ تو اے جانِ غزل!
ایسا کرنا مری آنکھوں سے ادا ہو جانا

بے نیازی بھی وہی اور تعلق بھی وہی
تمہیں آتا ہے محبت میں خدا ہو جانا

اژدہا بن کے رگ و پے کو جکڑ لیتا ہے
اتنا آسان نہیں غم سے رِہا ہو جانا

اچھے اچھوں پہ بُرے دن ہیں لہٰذا فارس
اچھے ہونے سے تو اچھا ہے بُرا ہو جانا

○

غم چھایا رہتا ہے دِن بھر آنکھوں پر
فارس ! اُس کے نام کا دم کر آنکھوں پر

جب دیکھو پلکیں جھپکاتا رہتا ہے
اِتنا بھی اِترایا مت کر آنکھوں پر

چلیے، آپ محبت کو جانے دیجے
ترس ہی کھا لیجے میری تر آنکھوں پر

کہیے تو جی لیں، کہیے تو مر جائیں
صاحب! آپ کی سب باتیں سر آنکھوں پر

آنسو بن کر عین اذانِ فجر کے وقت
اُترے گا غم کا پیغمبر آنکھوں پر

کوئی کافر ہوگا جو ایمان نہ لائے
اُس بُت پر اور اُس کی کافر آنکھوں پر

جاتے جاتے لے جاؤ بوسوں کے پھول
ہاتھوں پر، لب پر، ماتھے پر، آنکھوں پر

آنکھوں کو مت غور سے دیکھا کر، پیارے!
آنکھیں رہ جاتی ہیں اکثر آنکھوں پر

فارس شب بھر خون ٹپکتا رہتا ہے
چلتے ہیں خوابوں کے نشتر آنکھوں پر

ایک شعر

خموشیوں کی زباں بھی سمجھنا ہوگی اُسے
پکارنے پہ ہی آیا تو یار کاہے کا ؟

○

یہ کیا کہ جب بھی مِلو، پُوچھ کے، بتا کے مِلو
کبھی کرو مجھے حیران، اچانک آ کے مِلو

دُعا سلام ہے کیا شَے ، مُصافحہ کیسا
تکلّفات کو چھوڑو، گلے لگا کے مِلو

محبتوں میں شش و پنج سے نکالو مجھے
نظر جُھکا کے مِلو یا نظر مِلا کے مِلو

عجب اصول ہیں اِس خوش مزاج بستی کے
کہ دِل میں گالیاں دو اور مسکرا کے مِلو

اُسی کے پاس تُمہارا علاج ہے فارس
دیارِ عشق کے بوڑھے شجر سے جا کے ملو

○

نم دیدہ دعاؤں میں اثر کیوں نہیں آتا؟
تُو عرشِ تغافل سے اُتر کیوں نہیں آتا؟

مَیں آپ کے پیروں میں پڑا سوچ رہا ہوں
مَیں آپ کی آنکھوں کو نظر کیوں نہیں آتا؟

اب شام ہوئی جاتی ہے اور شام بھی گہری
اے صبح کے بُھولے ہوئے! گھر کیوں نہیں آتا؟

○

مجھ کو سارا حساب آتا ہے
یعنی مَیں جمع تُو مُساوی عشق

○

پھول کھلا روِش روِش ، نُور کا اہتمام کر
حضرتِ قیس آئے ہیں ، دشتِ جنوں ! سلام کر

سینہ نہ پِیٹ ، ہجر زاد ! سینے میں دِل مقیم ہے
دِل میں جنابِ یار ہیں ، اُن کا تو احترام کر

مصرعۂ چشم و لب سُنا ، نغمۂ حسن گُنگُنا
تُو ہے مری غزل کی جان ، جانِ غزل ! کلام کر

کوئی دوا بتا مجھے ، تھوڑا سکوں دِلا مجھے
آگ ہوں مَیں ، بجھا مجھے ، وحشی ہوں ، مجھ کو رام کر

عشق کا مقتدی ہے تُو ، جیسے پڑھائے ویسے پڑھ
اپنی نماز بھول جا ، پیرویٔ اِمام کر

سائیں جی! کھو گیا تھا میں، شکر ہے آپ مِل گئے
پہنچا ہوں اپنے آپ تک آپ کا ہاتھ تھام کر

ہجر قدیم بھید ہے ، وصل عظیم بھید ہے
ہجر کی رمز کھول دے ، وصل کا راز عام کر

اچھا نہیں ہے اتنا جوش، اُڑنے لگے ہیں سب کے ہوش
فارسِ بے ادب ! خموش ، اب یہ غزل تمام کر

○

جھانکتے جھانکتے کنارے سے
رات مَیں گر پڑا ستارے سے

ویسے مَیں صف میں آخری تھا مگر
اُس نے بلوا لیا اشارے سے

اور پاس آ گیا بچھڑ کر تُو
فائدہ ہو گیا خسارے سے

گھر نہیں، بے گھری بنائی ہے
مَیں نے وحشت کے اینٹ گارے سے

شاعروں نے کمائی کی ہے بہت
رائیگانی کے استعارے سے

تُو مرے رَب کا فیصلہ ہے میاں!
تجھ کو پایا ہے استخارے سے

اِک مسافر کو دیکھتا تھا کوئی
شہر کے آخری منارے سے

تلخیوں کے علاوہ کیا ملتا
ایک میٹھے کو ایک کھارے سے

کچھ نہ پوچھو کہ کیا کِیا فارس
ایک پیارے نے ایک پیارے سے

O

ایسے ہیں یہ الگ الگ، جیسے جدا ہیں مشرقَین
چَین کے روز و شب میں عشق، عشق کے روز و شب میں چَین

آپ نے پھول توڑ کر بھر لی ہے ٹوکری مگر
سُنیے تو پیڑ کی کراہ، سُنیے تو ٹہنیوں کے بَین

کب وہ بہارِ جاں فزا اُترے گی میرے صحن میں
چہکے گا کب خموش دن؟ مہکے گی کب اُداس رَین؟

تیرے خیال پر فدا غالب و میر و مصحفی
تیرے جمال کے گدا مانی، پکاسو، صادقین

دل میں دبا کے چیخ مَیں ہجر کے گھاٹ اتر گیا
مجھ کو پکارتے رہے دُور سے دو سیاہ نَین

مے کدہَ خمار ایک، کوچہَ یادگار ایک
دو ہی مقام ہیں عزیز یعنی ہمارے قبلتین

سُنّی ہوں مَیں تو کیا ہوا؟ دِین ہے کربلا مرا
فارسِ کربلائی ہوں یعنی کہ عاشقِ حُسَینؑ

○

اگرچہ بزم میں بالکل سمٹ کے مِلتا ہے
مگر وہ تنہا ملے تو لپٹ کے مِلتا ہے

بدن وصال کا خواہاں، دماغ ضبط میں گُم
عجیب شخص ہے، ٹکڑوں میں بٹ کے مِلتا ہے

یہ بازگشت کا احسان ہے کہ لوٹ آئی
وگرنہ کون کسی سے پلٹ کے مِلتا ہے

غمِ جہاں ہے غمِ یار سے بہت پہلے
مگر جو لُطف یہ ترتیب اُلٹ کے مِلتا ہے

اُسے خبر ہے کہ رسوائیاں بھی ہوں گی مگر
بڑا دلیر ہے وہ شخص، ڈٹ کے مِلتا ہے

○

وداعِ یار کا لمحہ ٹھہر گیا مجھ میں
مَیں خود تو زندہ رہا، وقت مر گیا مجھ میں

سکوتِ شام میں چیخیں سنائی دیتی ہیں
تُو جاتے جاتے عجب شور بھر گیا مجھ میں

وہ پہلے صرف مری آنکھ میں سمایا تھا
پھر ایک روز رگوں تک اتر گیا مجھ میں

کچھ ایسے دھیان میں چہرہ ترا طلوع ہوا
غروبِ شام کا منظر نکھر گیا مجھ میں

مَیں اُس کی ذات سے منکر تھا اور پھر اِک دن
وہ اپنے ہونے کا اعلان کر گیا مجھ میں

کھنڈر سمجھ کے مِری سیر کرنے آیا تھا
گیا تو موسمِ غم پھول دھر گیا مجھ میں

گلی میں گونجی خموشی کی چیخ رات کے وقت
تمہاری یاد کا بچہ سا ڈر گیا مجھ میں

یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے فارس
مَیں اُس میں سمٹا رہا، وہ بکھر گیا مجھ میں

○

وصال رُت بھی اگر آئے، کم نہیں ہوتے
وہ غم جو ہجر میں ملتے ہیں، غم نہیں ہوتے

کسی کے نام کو لکھ لکھ کے کاٹنے والو!
قلم کی نوک سے رشتے قلم نہیں ہوتے

تُمہیں ملیں بھی تو کیسے کہ آج کل، یارو!
ہم اپنے آپ کو اکثر بہم نہیں ہوتے

ہمیں پسند نہیں ہے ہجوم میں ہونا
ہماشُما جہاں ہوتے ہیں، ہم نہیں ہوتے

اگر ہنسوں بھی تو آنکھیں اُداس رہتی ہیں
عجیب غم ہیں، خوشی میں بھی کم نہیں ہوتے

یہ مملکت ہے میاں مملکت محبت کی
سو تاج و تخت یہاں محترم نہیں ہوتے

تھکن کے دیو کا سایہ ہے میری بستی پر
یہاں کے باسی کبھی تازہ دم نہیں ہوتے

شجر کی گود ہمیشہ بھری ہی رہتی ہے
پرندے نقل مکانی سے کم نہیں ہوتے

یہ کیسے لوگ ہیں فارس کہ میری چیخوں سے
کسی کی آنکھ کے کونے بھی نم نہیں ہوتے

○

پہنچ سے دور، چمکتا سراب یعنی تُو
مجھے دکھایا گیا ایک خواب یعنی تُو

مَیں جانتا ہوں ببول اور گلاب کے معنی
ببول یعنی زمانہ، گلاب یعنی تُو

جمالیات کو پڑھنے کا شوق تھا سو مجھے
عطا ہوا ہے مکمل نصاب یعنی تُو

بہت طویل سہی داستانِ دل لیکن
بس ایک شخص ہے لُبِّ لباب یعنی تُو

کہاں یہ ذرّۂ تاریک بخت یعنی مَیں
کہاں وہ نور بھرا ماہتاب یعنی تُو

چکھے بغیر ہی جس کا نشہ مسلسل ہے
مجھے بہم ہے اک ایسی شراب یعنی تُو

بدل گئی ہے بہت مملکت مرے دِل کی
کہ آ گیا ہے یہاں انقلاب یعنی تُو

ہر اِک غزل کو سمجھنے کا وقت ہے نہ دماغ
مجھے بہت ہے فقط انتخاب یعنی تُو

کوئی سوال ہے جس کو جواب ملتا نہیں
سوال یعنی کہ فارس، جواب یعنی تُو

○

کیوں ترے ساتھ رہیں عُمر بسر ہونے تک؟
ہم نہ دیکھیں گے عمارت کو کھنڈر ہونے تک

تم تو دروازہ کُھلا دیکھ کے در آئے ہو
تم نے دیکھا نہیں دیوار کو در ہونے تک

چپ رہیں؟ آہ بھریں؟ چیخ اٹھیں یا مر جائیں؟
کیا کریں بے خبرو! تم کو خبر ہونے تک

حال مت پوچھیے، کچھ باتیں بتانے کی نہیں
بس دعا کیجے دعاؤں میں اثر ہونے تک

سگِ آوارہ کے مانند محبت کے فقیر
دربدر ہوتے رہے شہر بدر ہونے تک

آپ مالی ہیں نہ سورج ہیں نہ موسم پھر بھی
بیج کو دیکھتے رہیے گا ثمر ہونے تک

دشتِ خاموش میں دم سادھے پڑا رہتا ہے
پاؤں کا پہلا نشاں راہ گذر ہونے تک

فانی ہونے سے نہ گھبرایئے فارس کہ ہمیں
ان گنت مرتبہ مرنا ہے امر ہونے تک

○

چھوڑ سارے دھیان ، فارس ! عشق کر
عشق کر، رحمان فارس ! عشق کر

مَیں ہوں تیرے اندرونے کی صدا
میرا کہنا مان، فارس ! عشق کر

دل کی چنگاری سے اب شعلہ اُٹھا
تجھ میں ہے امکان، فارس ! عشق کر

عشق مقصد ہے تری تخلیق کا
اپنا مقصد جان، فارس ! عشق کر

عشق میں ہی یار کی پہچان ہے
یار کو پہچان، فارس ! عشق کر

جسم کی ضد ہے کہ بس کارِ ہوس
روح کی گردان، فارس ! عشق کر

ہو چکے چھپ چھپ کے سجدے ہو چکے
اب علی الاعلان فارس ! عشق کر

○

نہیں ہے اپنی تباہی کا کچھ ملال مجھے
تو کیا دکھائی نہیں دیتا اپنا حال مجھے ؟

مجھے اُداسی کا سرطان تھا سو ڈرتے تھے لوگ
سو آپ کرنا پڑی اپنی دیکھ بھال مجھے

تُو ایک نخلِ جواں، تیرا بوڑھا مالی مَیں
ترے عروج پہ بخشا گیا زوال مجھے

سخی! مَیں اور کسی در پہ جا نہیں سکتا
ترے ہی در کا بھکاری ہوں، لاکھ ٹال مجھے

ہنر ورو! مرے فن پر کرو گے کیا تحقیق؟
سوائے غم نہیں حاصل کوئی کمال مجھے

مَیں تیری راہ میں بیٹھا ہوں، اُٹھ نہ جاؤں کہیں
خدا کے واسطے کر ڈال پائمال مجھے

لباسِ عمر مرے جسم و جاں پہ تنگ رہا
کبھی جچے ہی نہیں میرے ماہ و سال مجھے

مَیں آدمی ہوں فرشتہ نہیں مگر ترے بعد
کبھی نہ آیا کسی اور کا خیال مجھے

○

تُم احتیاط کے مارے نہ آئے بارِش میں
ہمارے ساتھ پرندے نہائے بارِش میں

کھڑے تھے دونوں طرف پیڑ چھتریاں لے کر
کہ راستہ نہ کہیں بھیگ جائے بارِش میں

چُھپے ہوئے تھے پسِ پیرہن جو شرما کر
وہ انگ رنگ بہت جھلملائے بارِش میں

بڑا انوکھا رِدھم تھا برستی بُوندوں کا
ہوا نے رات بہت گیت گائے بارِش میں

گئی رُتوں کی کوئی ایسی بات یاد آئی
نہ پھُول پات نہ ہم مُسکرائے بارِش میں

برستے مینہ میں بھی اشکوں کی لَو بلند رہی
یہ وہ چراغ ہیں جو بُجھ نہ پائے بارِش میں

مَیں اتنے رنگ بکھرتے نہ دیکھ پاؤں گا
خدارا کوئی بھی تتلی نہ جائے بارِش میں

کسی کو آئی نظر کھلکھلاتی قوسِ قزح
کسی نے دیکھے اُداسی کے سائے بارِش میں

خدا گواہ کہ مَے جیسا لُطف دیتی ہے
تری بنائی ہوئی گرم چائے بارِش میں

ہم آج بھیگ گئے سر سے پاؤں تک فارس
کسی کے غم نے وہ چھینٹے اُڑائے بارِش میں

O

تُو حکم کر، نہ جاؤں تو جو چور کی سزا
پھر مَیں پلٹ کے آؤں تو جو چور کی سزا

بے خوف آ کے مِل کہ ترے اِذن کے بغیر
مَیں آنکھ بھی اُٹھاؤں تو جو چور کی سزا

چوری کروں گا بس ترا دِل، نیند اور چین
مَیں اور کچھ چراؤں تو جو چور کی سزا

مجھ بے نوا گدا کو نہ در سے اُٹھاؤ تُم
ہاں گر صدا لگاؤں تو جو چور کی سزا

صدیوں تُو آزما لے بھلا میرے صبر کو
شکوہ زباں پہ لاؤں تو جو چور کی سزا

مَیں ہارنے ہی آیا ہوں، تُو کھیل تو سہی
تجھ کو نہ جیت پاؤں تو جو چور کی سزا

جی بھر کے آج مجھ کو پِلا اور ساتھ چل
تھوڑا بھی ڈگمگاؤں تو جو چور کی سزا

○

گرچہ مہنگا ہے مذہب، خُدا مُفت ہے
اک خریدو گے تو دوسرا مُفت ہے

آئینوں کی دُکاں میں لکھا تھا کہیں
آپ اندھے ہیں تو آئنہ مُفت ہے

اُس نے پوچھا کہ پازیب کتنے کی ہے؟
سارا بازار چِلّا اُٹھا: مُفت ہے

آخری سانس کے بعد عُقدہ کُھلا
مَیں سمجھتا رہا تھا ہوا مُفت ہے

فیصلہ کیجیے، بھاؤ تاؤ نہیں
یا محبت ہے انمول یا مُفت ہے

دوسرا جان دے کے بھی مِلتا نہیں
عشق کی ڈور کا اِک سرا مُفت ہے

○

تمام ان کہی باتوں کا ترجمہ کر کے
کوئی بتائے اُن آنکھوں کا ترجمہ کر کے

سناؤں گا نہیں لیکن کہا تو ہے اک شعر
تمہاری ساری اداؤں کا ترجمہ کر کے

مَیں کافی باتیں پسِ گفتگو بھی کرتا ہوں
مجھے سنو مری سوچوں کا ترجمہ کر کے

غزل نگار ہوا نے تمام شاخوں پر
لکھے ہیں گُل ترے گالوں کا ترجمہ کر کے

مَیں دور دیس کے اِک شخص کو لُبھاؤں گا
جنابِ میر کے شعروں کا ترجمہ کر کے

تراجم

"A translation is no translation unless it will give you the music of a poem along with the words of it."

John Millington Synge

"The Aran Islands" (1907)

(i)

سبھی سرگوشیاں جب ہار کے دم توڑ دیتی ہیں

"Music when Soft Voices Die"
P. B. Shelley

سبھی سرگوشیاں جب ہار کے دم توڑ دیتی ہیں
کوئی نغمہ مسلسل گونجتا ہے دھیان میں پھر بھی
بنفشے کے سبھی پھولوں کو لے جاتی ہے جب پت جھڑ
کوئی خوشبو جواں رہتی ہے دل دالان میں پھر بھی

گلابوں کی جواں مرگی پہ کچھ عرصہ فُغاں کر کے
بکھرتی پتّیاں سجتی ہیں پیاری خواب گاہوں میں
سو ایسے ہی تری یادیں ہیں میرے ساتھ تیرے بعد
محبت تا ابد زندہ رہے گی میری آہوں میں

(ii)

سوچتا ہوں صیدِ مرگِ ناگہاں ہوجاؤں گا

"Cease to be"
John Keats

سوچتا ہوں صیدِ مرگِ ناگہاں ہو جاؤں گا
دل کے باغیچے سے گلہائے جنوں چُننے سے قبل
اور مٹی اوڑھ کر اِک قبر میں سو جاؤں گا
حیرتوں والے صحیفوں کے سبق سُننے سے قبل

جب ستاروں سے دمکتی شب کے خدّوخال پر
دیکھتا ہوں روشنی اِک غیر فانی عشق کی
سوچ کر افسردہ ہوتا ہوں مَیں اپنے حال پر
مجھ کو مہلت ہی نہیں اِس آسمانی عشق کی

سوچتا ہوں، اے مری محبوبۂ یک دو نَفَس!
تیرے حُسنِ بے کراں کو کب تلک تک پاؤں گا؟
جب اجل آ کر کہے گی : شاعرِ نادان ! بس
تب مَیں ہستی ترک کر دوں گا، فنا ہو جاؤں گا

آنکھ مٹ جائے گی، سارے خواب گم ہو جائیں گے
عشق اور شہرت عدم آباد میں کھو جائیں گے

(iii)

کہیں جو خوبیٔ قسمت سے مجھ کو مل جاتیں

"Aedh Wishes for the Cloths of Heaven"
W.B.Yeats

کہیں جو خوبیٔ قسمت سے مجھ کو مِل جاتیں
خدا کے ہاتھ سے جنت کی خلعت و پوشاک
سنہری نُور سے بُنوائے شوخ پیراہن
نہ جن کی جیب دریدہ، نہ جن کا دامن چاک
اُنہیں مَیں تیرے حسیں پاؤں میں بچھا دیتا
خدا گواہ، تری رہگزر سجا دیتا

مگر مَیں ایک تہی دست و رائیگاں شاعر
سوائے خواب مرے پاس اور کچھ بھی نہیں
سو مَیں نے خواب بچھائے ہیں تیرے رستے میں
بجز سراب مرے پاس اور کچھ بھی نہیں

سو اپنی راہ پہ ہولے سے پاؤں دھر، اے دوست!
نہ بُھول، چلتی ہے تُو میرے خواب پر، اے دوست!

(iv)

چمکتے ستارے! اگر مَیں تری طرح لافانی ہوتا

"Bright Star! Would I were stedfast as thou art"
John Keats

چمکتے ستارے! اگر مَیں تری طرح لافانی ہوتا
تو اِس طرح تنہائی میں بامِ شب پر معلق نہ ہوتا
کسی رات بھر جاگنے والے صحرا نشیں سا نہ ہوتا
نہ اپنی ابدتاب پلکیں بکھیرے
رواں پانیوں کو وضو کرتے تکتا
زمینوں کے چَو، گرد اور نسلِ انساں کے سب ساحلوں تک
نہ مَیں تانکتا جھانکتا برف والے نقابوں کو
سب چوٹیوں، وادیوں سے سرکتے ہوئے

نہیں، مَیں اگر تجھ سا لافانی ہوتا

تو اپنی جواں سال محبوبۂ نرم و نازک کے گدرائے
بھرپور سینے کو تکیہ بناتا
وہ جب سانس لیتی تو محسوس کرتا
شفق رنگ سینے کے ہر زیر و بم کو
شب و روز مَیں چند میٹھی اُمیدوں سے بیدار رہتا
ہمیشہ ہمیشہ مَیں اُس کی مہک ریز سانسوں کو سُنتا
ابد تک، ابد تک مَیں لافانی رہتا
اگر یُوں نہیں تو......

اچانک مَیں مر جاتا اور پُھوٹ جاتا
فلک سے مَیں چپ چاپ ہی ٹُوٹ جاتا

(v)

شرمیلی محبوبہ سے

"To His Coy Mistress"
Andrew Marvell

ہمارے پاس اگر وقت ہوتا لا محدود
فنا پذیر نہ ہوتا اگر ہمارا وجود
تو میری جان! ترا روٹھنا روا ہوتا
تری جھجک، ترا شرمیلا پن بجا ہوتا

بڑے سکون سے ہم بیٹھے سوچتے، مری جاں!
ہمیشگی کا یہ دورانیہ گذاریں کہاں

تُو بحرِ سبز کے ساحل پہ سیپیاں چُنتی
شبِ خموش میں لہروں کی آہٹیں سُنتی
مَیں دُور بیٹھا فقط تجھ کو دیکھتا رہتا
کبھی کبھار ترے حسن پر غزل کہتا

تجھے مَیں چاہتا تخلیقِ روح سے بھی قبل
قدیم عہد کے طوفانِ نوح سے بھی قبل

ہمارے پاس اگر وقت ہوتا لا محدود
فنا پذیر نہ ہوتا اگر ہمارا وجود
تو پھر بھلے مجھے رد کرتی اِک زمانے تک
شروعِ وقت سے عیسیٰ کے دار پانے تک

خدا گواہ مرا عشق مستقل رہتا
خوشی سے مَیں ترا انکار تا ابد سہتا

ترے لبوں کی ستائش مَیں سو برس کرتا
ہزار سال تری انکھڑیوں کا دم بھرتا
محبتیں کئی قرنوں کی مجھ میں بھر جاتیں
بہت سی صدیاں تجھے دیکھتے گذر جاتیں

کہ تیرا حسن انہی شدتوں کا ہے حقدار
اور اِس سے پست نہیں میرے عشق کا معیار

مگر مَیں سنتا ہوں دِن رات موت کی آہٹ
عجب ہے مرگ کے شعلے کی تیز گرماہٹ
کفن میں باقی رہے گا نہ تیرا حسن و جمال
نہ قبر میں مُجھے آئے گا عاشقی کا خیال

ہمارے جسم تہِ خاک جونہی جائیں گے
تو حُسن و عشق کو کیڑے مکوڑے کھائیں گے

سو جب تلک ہے ترے چشم و لب کا رنگ جواں
جہاں تلک ہے مری جستجو کے شعلے میں جاں
منائیں خواہش و خواب و خیال کا تہوار
گلے مِلیں کہ ابھی اوج پر ہے رنگِ بہار
حیات جتنی بھی تھوڑی ہے بس غنیمت ہے
مِلی جو مہلتِ یک دو نفس، غنیمت ہے

اک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

○

عُمر بھر عشق کسی طور نہ کم ہو، آمین
دِل کو ہر روز عطا نعمتِ غم ہو، آمین

میرے کاسے کو ہے بس چار ہی سِکّوں کی طلب
عشق ہو، وقت ہو، کاغذ ہو، قلم ہو، آمین

میر کے صدقے مرے حرف کو درویشی مِلے
دُور مجھ سے ہوَسِ دام و درَم ہو، آمین

حُجرۂ ذات میں یا محفلِ یاراں میں رہوں
فکر دُنیا کی مجھے ہو بھی تو کم ہو، آمین

نہ ڈرا پائے مجھے تیرگیٔ دشتِ فراق
ہر طرف روشنیٔ دیدۂ نم ہو، آمین

جب مَیں خاموش رہوں، رونقِ محفل ٹھہروں
اور جب بات کروں ، بات میں دم ہو، آمین

عشق میں ڈوب کے جو کچھ بھی لکھوں کاغذ پر
خود بخود لوحِ زمانہ پہ رقم ہو، آمین

لوگ چاہیں بھی تو ہم کو نہ جُدا کر پائیں
یُوں مری ذات تری ذات میں ضم ہو، آمین

جب زمیں آخری حدّت سے پگھلنے لگ جائے
عشق کی چھاؤں مرے سر کو بہم ہو، آمین

دشتِ امکاں میں تحیّر مرا قائم ہی رہے
میرا ہر ایک قدم پہلا قدم ہو، آمین

میرے کانوں نے سُنا ہے ترے بارے میں بہت
میری آنکھوں پہ بھی تھوڑا سا کرم ہو ، آمین

○

مجھے غرض ہے ستارے نہ ماہتاب کے ساتھ
چمک رہا ہے یہ دل پوری آب و تاب کے ساتھ

نپی تُلی سی محبت، لگا بندھا سا کرم
نبھا رہے ہو تعلق بڑے حساب کے ساتھ

ارے یہ صرف بہانہ ہے بات کرنے کا
مری مجال کہ جھگڑا کروں جناب کے ساتھ؟

سوالِ وصل پہ انکار کرنے والے ! سُن
سوال ختم نہیں ہو گا اس جواب کے ساتھ

خموش جھیل کے پانی میں وہ اداسی تھی
کہ دِل بھی ڈوب گیا رات ماہتاب کے ساتھ

جتا دیا کہ محبت میں غم بھی ہوتے ہیں
دیا گلاب تو کانٹے بھی تھے گلاب کے ساتھ

مَیں اس لیے نہیں تھکتا ترے تعاقب سے
مجھے یقیں ہے کہ پانی بھی ہے سراب کے ساتھ

وصال و ہجر کی سرحد پہ جھٹپٹے میں کہیں
وہ بے حجاب ہوا تھا مگر حجاب کے ساتھ

وہاں مِلوں گا جہاں دونوں وقت ملتے ہیں
مَیں کم نصیب ترے جیسے کامیاب کے ساتھ

تُم اچھی دوست ہو سو میرا مشورہ یہ ہے
مِلا جُلا نہ کرو فارسِ خراب کے ساتھ

○

نہیں مطلب نہیں اُس کی نہیں کا
یہ دِل سمجھا نہیں، پاگل کہیں کا

ستارے ماند ہیں سب تیرے ہوتے
کہ تُو ہے چاند، وہ بھی چودھویں کا

مَیں روتا ہوں تو روتے ہیں در و بام
مکاں بھی دُکھ سمجھتا ہے مکیں کا

یہ کیسے موڑ پر چھوڑا ہے تُو نے
مجھے چھوڑا نہیں تُو نے کہیں کا

کیے سجدے کچھ اتنے اُس کے در پر
نشاں سا پڑ گیا میری جبیں کا

مری گردن تک آ پہنچا تو جانا
مرا تو ہاتھ ہے سانپ آستیں کا

لباسِ سُرخ میں ملبوس لڑکی
چھلکتا جام حُسنِ احمریں کا

نہ جانے بات کیا تھی اُس گلی میں
کہ ہو کے رہ گیا فارس وہیں کا

○

عشق کچھ ایسی گدائی ہے کہ سبحان اللہ
ہم نے خیرات وہ پائی ہے کہ سبحان اللہ

شام ہوتے ہی کسی بُھولے ہوئے غم کی مہک
صحن میں یوں اُتر آئی ہے کہ سبحان اللہ

آنکھ اُٹھا کر مَیں ترے عارض ولب کیا دیکھوں
پاؤں ہی ایسا حنائی ہے کہ سبحان اللہ

چہرے پڑھتا ہوں کتابیں نہیں پڑھتا اب مَیں
یہ پڑھائی وہ پڑھائی ہے کہ سبحان اللہ

پا بہ گِل ہوں مگر اُڑتا ہوں میں خوشبو بن کر
قید مَیں ایسی رہائی ہے کہ سبحان اللہ

اِک گلِ تر سے ٹپکتی ہوئی شبنم نے مجھے
آنکھ وہ یاد دلائی ہے کہ سبحان اللہ

چُھونے والا بھی مہکتا ہی چلا جاتا ہے
ایسی کلیوں سی کلائی ہے کہ سبحان اللہ

سب کی آنکھوں سے بچا کر کسی شرمیلے نے
ہم سے یوں آنکھ مِلائی ہے کہ سبحان اللہ

دِل چُراتا ہے وہ کم بخت بِنا آہٹ کے
ہاتھ میں ایسی صفائی ہے کہ سبحان اللہ

آج اِک شوخ نے فارس مجھے میری ہی غزل
ایسے شرما کے سُنائی ہے کہ سبحان اللہ

○

ضبط کے امتحان سے نکلا
پھول آخر چٹان سے نکلا

جان تن سے نکل گئی لیکن
تُو نہیں میرے دھیان سے نکلا

نہ نکلنے پہ تھا بضد سورج
پھر کسی کی اذان سے نکلا

شجرہ دیکھا گیا تو پتھر بھی
پھول کے خاندان سے نکلا

اب مکمل ہوئی ہے یکجائی
عشق بھی درمیان سے نکلا

دیکھتا تھا چراغ بن کر مَیں
سایہ سا اُس مکان سے نکلا

اُن لبوں پر یقین کر کے مَیں
شہرِ وہم و گمان سے نکلا

داستاں گو کو مارنے کے لیے
سامری داستان سے نکلا

جس کو پاتال میں کیا تھا دفن
ساتویں آسمان سے نکلا

تیر سا کچھ پلک جھپکتے ہی
ابروؤں کی کمان سے نکلا

اب ہوں نادم کہ طیش میں فارس
جانے کیا کیا زبان سے نکلا

○

کمبخت دل کو کیسی طبیعت عطا ہوئی
جب جب بھی دُکھ اُٹھائے، مسّرت عطا ہوئی

پھر قحط سے مَرے ہوئے دفنا دیئے گئے
اور چیونٹیوں کے رِزق میں برکت عطا ہوئی

اُس حکم میں تھی ایسی رعونت کہ پہلی بار
ہم بزدلوں کو کفر کی ہمت عطا ہوئی

مَیں کیوں نہ فخر اُدھڑی ہوئی کھال پر کروں
اک شعر تھا کہ جس پہ یہ خلعت عطا ہوئی

مے خوار یار بھی تھے وہیں، مے فروش بھی
دوزخ میں ہم کو چھوٹی سی جنت عطا ہوئی

مرتی محبتوں کے سرہانے پڑھا درود
اور پہلے وِرد سے ہی سہولت عطا ہوئی

پتھر تھا، صدیوں رگڑا گیا، آئنہ بنا
تب جا کے مجھ کو تیری شباہت عطا ہوئی

انعام عشق کا تو بہت بعد میں مِلا
پہلے تو مجھ کو عشق کی حسرت عطا ہوئی

مزدوری کر کے بیٹھا رہا مَیں کئی برس
لیکن پسینہ سوکھا نہ اُجرت عطا ہوئی

○

عشق کرنے میں اک خرابی ہے
حُسن اوقات میں نہیں رہتا

○

اِک دوانے سے بھرے شہر کو جا لگتی ہے
یہ محبت تو مجھے کوئی وبا لگتی ہے

روز آتی ہے مرے پاس تسلی دینے
شبِ تنہائی ! بتا تُو مری کیا لگتی ہے ؟

اِک فقط تُو ہے جو بدلا ہے اچانک ورنہ
لگتے لگتے ہی زمانے کی ہوا لگتی ہے

وہ جو مِلتی ہی نہیں حالتِ بیداری میں
آنکھ لگتے ہی مرے سینے سے آ لگتی ہے

آنکھ سے اشک گِرا ہے، سو میاں! ہاتھ اُٹھا
تارہ ٹُوٹے پہ جو کی جائے دُعا، لگتی ہے

بات جتنی بھی ہو بے جا، مگر اے شیریں سُخن!
تیرے ہونٹوں سے ادا ہو تو بجا لگتی ہے

سب پجاری ہیں اُسی ایک بُتِ کافر کے
بات کڑوی ہے مگر بات خُدا لگتی ہے

خوش گُمانی کا یہ عالم ہے کہ فارس اکثر
یار کرتے ہیں جفا، ہم کو وفا لگتی ہے

○

تجھ کو بھی ذوقِ سیر و تماشا ہے تو بتا
اگلا پڑاؤ عشق ہے، چلنا ہے تو بتا

کام آ پڑا ہے یار مجھے اک درخت سے
جنگل میں کوئی جاننے والا ہے تو بتا

بیٹھی ہے اچھے بَر کے لیے کب سے شامِ غم
تیری نظر میں کوئی اُجالا ہے تو بتا

تجھ سے نظر ہٹا کے مَیں اُس پر نظر کروں
دنیا میں کوئی بھی ترے جیسا ہے تو بتا

دروازہ کھول دوں کہ لگا دوں مَیں چٹخنی؟
جانا ہے تو بتا دے، ٹھہرنا ہے تو بتا

فرصت بھی ہے، بہار بھی، خلوت بھی، شام بھی
غزلیں بھی اور جام بھی، مِلنا ہے تو بتا

مانا کہ جانثار ترے بے شمار ہیں
کوئی بھی مجھ سے بڑھ کے دوانہ ہے تو بتا

جھونکا ہوں اور محوِ سفر ہوں مَیں دم بدم
اے خوشبوئے اسیر! بکھرنا ہے تو بتا

صحرا ہے جس کو دِل میں لیے پھر رہا ہوں مَیں
اے یار! تیری آنکھ میں دریا ہے تو بتا

منزل تلک پہنچنا مری آرزو نہیں
فارس! بھٹکنے کا کوئی رستہ ہے تو بتا

○

تارِ مژگاں پہ ہم تیری یادوں کے جگنو پرونے لگے
شام ڈھلنے لگی، درد بڑھنے لگا، شعر ہونے لگے

○

عشق سے پہلے بُلاتا تھا مَیں تُو کر کے اُسے
لیکن اب تو سوچتا بھی ہوں وضو کر کے اُسے

اُس کا مقصد قتل ہے میرا تو بسم اللہ کرے
سرخرو ہو جاؤں گا مَیں سرخرو کر کے اُسے

سرخ انگاروں بھری وہ آگ جب بجھنے کو تھی
رکھ لیا مَیں نے رگ و پے میں لہو کر کے اُسے

اتنی آسانی سے مت کھونا اُسے، اے میرے دِل!
یاد ہے پایا تھا کتنی جستجو کر کے اُسے ؟

شکر ہے فارس تُو ہرنی کی مدد کو آ گیا
بھیڑیے دہلا رہے تھے ہاؤہو کر کے اُسے

○

کتنی شدت سے تجھے ہم نے سراہا، آہا
تیری پرچھائیں کو بھی ٹوٹ کے چاہا، آہا

آخری سانس کی لذّت کوئی اُس سے پوچھے
مرتے مرتے بھی جو بیمار کراہا: آہا

شعر کہنا ہے تو یُوں کہہ کہ ترا دشمن بھی
دشمنی بھول کے چِلّا اٹھے: آہا، آہا

تیری آنکھوں میں کھٹکتا ہے مرے جیسا فقیر
کیسا اعلیٰ ترا معیار ہے، شاہا ! آہا

کل مرے حق میں تھا اور آج مخالف ہوا تُو
کیسے بدلا ہے بیاں تُو نے، گواہا ! آہا

○

ہم تجھ سے دُور اور ترے آس پاس لوگ
یوں کب تلک جئیں گے بھلا ہم اداس لوگ

مطلب نہ ہو تو کیسے مِلیں اور کیوں مِلیں؟
ہم جیسے عام لوگوں سے تُم جیسے خاص لوگ

○

سر سے لے کر پاؤں تک ساری کہانی یاد ہے
آج بھی وہ شخص مجھ کو منہ زبانی یاد ہے

○

مَیں کارآمد ہوں یا بے کار ہوں مَیں
مگر اے یار! تیرا یار ہوں مَیں

جو دیکھا ہے کسی کو مت بتانا
علاقے بھر میں عزت دار ہوں مَیں

خود اپنی ذات کے سرمائے میں بھی
صِفَر فیصد کا حصے دار ہوں مَیں

اور اب کیوں بَین کرتے آ گئے ہو؟
کہا تھا نا بہت بیمار ہوں مَیں؟

مری تو ساری دنیا بس تمھی ہو
غلط کیا ہے جو دنیادار ہوں مَیں

کہانی میں جو ہوتا ہی نہیں ہے
کہانی کا وہی کردار ہوں مَیں

یہ طے کرتا ہے دستک دینے والا
کہاں در ہُوں کہاں دیوار ہوں مَیں

کوئی سمجھائے میرے دشمنوں کو
ذرا سی دوستی کی مار ہوں مَیں

مجھے پتھر سمجھ کر پیش مت آ
ذرا سا رحم کر، جاں دار ہوں مَیں

بس اتنا سوچ کر کیجے کوئی حکم
بڑا منہ زور خدمت گار ہوں مَیں

اگر ہر حال میں خوش رہنا فن ہے
تو پھر سب سے بڑا فنکار ہوں مَیں

انہیں کھلنا سکھاتا ہوں مَیں فارس
گلابوں کا سہولت کار ہوں مَیں

○

ہر حقیقت سے الگ اور فسانوں سے پرے
منتظر ہوں مَیں ترا سارے زمانوں سے پرے

پھر مَیں اِک روز بڑی گہری اُداسی سے مِلا
بستیوں کے سبھی آباد مکانوں سے پرے

نہ زماں ہو نہ مکاں ہو نہ خلا ہو نہ خدا
صرف ہم تم ہوں کہیں سارے جہانوں سے پرے

عکس در عکس رُلاتی تھیں مجھے جو آنکھیں
چھوڑ آیا ہوں اُنہیں آئنہ خانوں سے پرے

خواب دیکھا ہے، دعا کر کہ یہ جھوٹا نکلے
مَیں کہیں اشک فشاں تھا ترے شانوں سے پرے

رونے دھونے کے لیے ہم نے بنایا ہوا ہے
اِک ٹھکانہ سبھی معلوم ٹھکانوں سے پرے

مَیں دعاؤں میں بھی کرتا ہوں ترے نام کا وِرد
تُو نہیں ہے مری تسبیح کے دانوں سے پرے

میرے رونے سے خفا ہو کے وہ بولا، فارس
اپنی چیخوں کو تُو لے جا مرے کانوں سے پرے

○

جس شہر میں سحر ہو، وہاں شب بسر نہ ہو
ایسا بھی عاشقی میں کوئی دربدر نہ ہو

کوشش کے باوجود نہ ہو، عُمر بھر نہ ہو
اللہ کرے کہ مجھ سے ترا غم بسر نہ ہو

فارس ! اسیرِ حلقہٗ دیوار و در نہ ہو
وحشت کی پہلی شرط یہی ہے کہ گھر نہ ہو

اُس کا یہ حکم ہے مجھے جاتا ہوا بھی دیکھ
اور یہ بھی شرط ہے کہ میاں آنکھ تر نہ ہو

رُخصت نہ مانگ ورنہ تجھے روک لُوں گا مَیں
یُوں مجھ کو چھوڑ جا کہ مجھے بھی خبر نہ ہو

نظروں سے لوگ گذریں گے لیکن خُدا کرے
دِل سے ترے علاوہ کسی کا گذر نہ ہو

یہ عشق کی ہے شرط کہ جو کچھ بھی پیش آئے
اے دِل ! ترا معاملہ زیر و زبر نہ ہو

باقی ہے کچھ خمار ابھی پچھلے عشق کا
اے تازہ عشق ! دیکھ ابھی میرے سر نہ ہو

اِس شرط پر چلوں گا ترے ساتھ، بے خودی !
تیرے علاوہ کوئی مرا ہمسفر نہ ہو

رُخسارِ یار کے تو ہیں بیمار سینکڑوں
تقسیم ایک انار کدھر ہو، کدھر نہ ہو

تُو نے ہر ایک حرف کو حرفِ دُعا کِیا
فارس ترے کلام میں کیسے اثر نہ ہو

○

موند کر آنکھ اُن آنکھوں کی عبادت کی جائے
شام دُنیا کے جھمیلوں میں نہ غارت کی جائے

تیرے پیروں سے ہی اُٹھتا نہیں ماتھا میرا
کس کو فرصت کہ ترے ہاتھ پہ بیعت کی جائے

تیری بات اور ہے، اے مجھ کو ستانے والے!
تُو زمانہ تو نہیں ہے کہ شکایت کی جائے

مصحفِ عشق میں آیا ہے کئی بار یہ حکم
درد کا شکر کیا جائے، دوا مت کی جائے

چھاگلیں دو ہیں فقط ہجر کے صحرا کے لیے
سو یہ لازم ہے کہ اشکوں میں کفایت کی جائے

صبر مشکل ہے مگر اتنا سمجھ لے فارس
کچھ نہیں ملتا اگر عشق میں عجلت کی جائے

○

ہجر میں ہے یہی تسکین مجھے
شعر مل جائیں گے دو تین مجھے

اُس نے مانگی تھی جدائی کی دُعا
اور کہنا پڑا آمین مجھے

اِن کو توڑیں تو مزہ آتا ہے
اچھے لگتے ہیں قوانین مجھے

اک کھلونا تھا کہ ٹوٹا تھا کبھی
آج بھی یاد ہے تدفین مجھے

تیری صورت کے علاوہ پیارے!
حفظ ہے سورۂ یاسین مجھے

ایک غم سے مَیں بہت خوش تھا مگر
اک خوشی کر گئی غمگین مجھے

کھردرے پن سے ملائم تن تک
آزماتی ہے تری جبین مجھے

کوئی بے رنگ مرے ساتھ چُھوا
اور پھر کر گیا رنگین مجھے

دُگنا حیراں ہوں کہ لگتا ہے وہ شخص
کبھی میٹھا، کبھی نمکین مجھے

کُو بہ کُو پھیل گئی بات سو کل
یاد آتی رہی پروین مجھے

بے نیازی کو تُو رکھ اپنے پاس
نہیں منظور یہ توہین مجھے

مرزا نوشہ سے ہوں بیعت، فارس
غیب دیتا ہے مضامین مجھے

○

اِدھر اُدھر کہیں کوئی نشاں تو ہو گا ہی
یہ رازِ بوسۂ لب ہے، عیاں تو ہو گا ہی

تمام شہر جو دُھندلا گیا تو حیرت کیوں؟
دلوں میں آگ لگی ہے، دھواں تو ہو گا ہی

مَیں کُڑھتا رہتا ہوں یہ سوچ کر کہ تیرے پاس
فلاں بھی بیٹھا ہو شاید، فلاں تو ہو گا ہی

بروزِ حشر ملے گا ضرور صبر کا پھل
یہاں تُو ہو نہ ہو میرا، وہاں تو ہو گا ہی

یہ بات نفع پرستوں کو کون سمجھائے؟
کہ کاروبارِ جنوں میں زیاں تو ہو گا ہی

یہ بات مدرسۂ دل میں کھینچ لائی مجھے
کہ درس ہو کہ نہ ہو، امتحاں تو ہو گا ہی

مگر وہ پھول کے مانند ہلکی پھلکی ہے
سو اس پہ عشق کا پتھر گراں تو ہو گا ہی

غزل کے روپ میں چمکے کہ آنکھ سے چھلکے
یہ اندرونے کا دکھ ہے، بیاں تو ہو گا ہی

بڑی امیدیں لگا بیٹھے تھے سو اب فارس
ملالِ بے رخیٔ دوستاں تو ہو گا ہی

○

میری ضد پر بھی جو تُو نے نہیں بتلائی مُجھے
ساری باتوں میں وہی بات پسند آئی مُجھے

○

ترے ذکر سے چِھڑ گئی بات کیا کیا
فسانے سُنے ہم نے کل رات کیا کیا

تُو رونے لگے گا اگر مَیں بتا دُوں
کہ ہنس ہنس کے جھیلے ہیں صدمات کیا کیا

وضو، قرأتِ آیتِ عشق، گریہ
تری دید کی ہیں رسومات کیا کیا

کبھی چال بدلی، کبھی راہ بدلی
کیے ہیں ترے پاؤں نے ہاتھ کیا کیا

مَیں جسموں کے جنگل سے گزرا تھا اک دن
کِھلے تھے درختوں پہ گُل پات کیا کیا

O

یادوں کا ابر چھایا ہے خالی مکان پر
کیا رنگ روپ آیا ہے خالی مکان پر

دیوار و در پہ نقش ہے اک بھولی بسری یاد
گزرے دنوں کا سایہ ہے خالی مکان پر

آسیب ہے کوئی جو اِسے چھوڑتا نہیں
ہر ٹونا آزمایا ہے خالی مکان پر

ہمسائے لا رہے ہیں اُداسی کی کچھ دوا
فی الحال دم کرایا ہے خالی مکان پر

اس میں ہے دفن اپنے مکینوں کا انتظار
کتبہ یہی لگایا ہے خالی مکان پر

سفرنامے

"Like all great travellers, I have seen more than I remember and remember more than I have seen."

Benjamin Disraeli

لندن

"The journey not the arrival matters."
T. S. Eliot

شام کے وقت خُنک دھند میں لپٹا ہوا شہر
دُور آفاق کی وسعت میں کہیں
مضمحل چاند تھکے ہارے مسافر کی طرح
مرحلہ وار تھکن سہتا ہوا
ابرِ آوارہ سے کچھ کہتا ہوا

شہر والوں کی نگاہوں میں عیاں
عظمتِ رفتہ کے گم گشتہ چراغ
گلی کوچوں میں اُسی سلطنتِ عہدِ گذشتہ کے نشاں
جو کراں تا بہ کراں پھیلی تھی
جس پہ سورج نہیں ہوتا تھا غروب
رہ گیا ایک جزیرہ، کیا خوب!

ٹیمز دریا کی جنوں خیز روانی میں کہیں
رُخِ مہتاب کا رقص
سانولے رنگ کے پانی میں کہیں
سرمئی شام کا عکس
اور دریا کے کنارے پہ کسی بینچ کے پاس
مَیں تری یاد میں گم
اپنی خاموش اُداسی کو بدن پر اوڑھے
ہنستے گاتے ہوئے لوگوں سے پرے
شہرِ آباد میں گم

میری خاموش نگاہوں میں عیاں
اپنی اُس سلطنتِ عشقِ گذشتہ کے نشاں
جو تری اور مری ہستی تھی
جس پہ سورج نہیں ہوتا تھا غروب
رہ گیا داغِ تمنا، کیا خوب!

پیرس

"Life is either a daring adventure or nothing at all."
Helen Keller

جدھر نگاہ کیجیے

ہجومِ مہ وشاں ہے

اور

سیلِ رنگ و بُو ہے

اور

اتنی تیز روشنی

کہ جیسے صد ہزار ماہتاب ایک دم ہوئے ہوں ضوفشاں

یہاں وہاں

جمالِ بے پناہ کے نئے نکور زاویے ہیں منکشف نگاہ پر

دلوں کی شاہراہ پر --- رواں دواں

ہیں قافلے امنگ کے

مُدھر صدا کے، خوش جمال رنگ کے

جدھر نگاہ کیجیے
بصارتوں پہ حیرتوں کی بارشیں
سماعتوں پہ مہرباں -- جواں ندائیں، کھنکھناتے قہقہے
کمال ہے
کسی کی کیا مجال ہے
کہ حُسن کے حضور جاں دیے بِنا گذر سکے

جدھر نگاہ کیجیے
نیا ہی ایک میکدہ کھُلا ہوا
نیا ہی ایک گلستاں سجا ہوا
حواس کو بہم ہیں اتنی لذتیں
کہ خود حواس کم لگیں
وہ ذائقے کہ الحذر، وہ شدتیں کہ الاماں
مگر تمام ہاؤہُو کے درمیاں
مَیں سوچتا ہوں، جانِ جاں!
بھلے مجھے بہم ہزار جام ہوں

مگر تری نگاہ کا سبو نہیں تو کچھ نہیں

بھلے ہزار خوش گلو بھی مجھ سے ہم کلام ہوں
مگر مری جو تجھ سے گفتگو نہیں تو کچھ نہیں

بھلے مرے ادھر اُدھر ہزار لالہ فام ہوں
جو تُو نہیں تو کچھ نہیں

جو تُو نہیں تو کچھ نہیں

انگلستان سے واپسی پر

"Take only memories. Leave only footprints."
Chief Seattle

کیا کیا گلاب رقص کناں رہگزر میں تھا
بادِ جنوں کے ساتھ مَیں دم دم سفر میں تھا

ایک آدھ شام بیتی مئے لالہ گوں کے ساتھ
دو چار دِن پڑاوٗ پرندوں کے گھر میں تھا

کچھ دِن دیارِ ماہ وشاں میں بسر کیے
کچھ دِن مرا قیام محبت نگر میں تھا

گلیوں میں تھیں قدیم پُراسرار خوشبوئیں
صدیوں پرانا بھید کوئی بام و در میں تھا

پانی وہاں کا سبز تھا، مٹی وہاں کی سُرخ
مَیں اِک عجیب سلسلۂ بحر و بر میں تھا

تنہا نہ تھا مَیں ٹیمز کی موجوں کے سحر میں
سارے کا سارے شہر اُنہی کے اثر میں تھا

پھولوں سے مَیں نے نظم سُنی ورڈز ورتھ کی
شیلے کا رنگ محوِ سُخن ہر شجر میں تھا

ماہِ تمام بن کے دکھائی دِیا مجھے
وہ معجزہ جو کیٹس کے دستِ ہنر میں تھا

خاموشیوں کی دُھن پہ تھرکتی تھیں دھڑکنیں
مَیں عام رقص میں نہیں، رقصِ دِگر میں تھا

اُڑتا رہا مَیں شام و سحر بادلوں کے ساتھ
پرواز کا جنون مرے بال و پر میں تھا

مجھ کو بہم تھیں حلقۂ یاراں کی صحبتیں
یعنی سفر میں ہوتے ہوئے بھی مَیں گھر میں تھا

لیکن نظر نواز نظاروں کے باوجود
اِک ان کہا سا دُکھ مرے شام و سحر میں تھا

اے تُو کہ تیری یاد ہے میری غزل کی رُوح
سُن لے کہ مَیں جدھر بھی گیا، تُو نظر میں تھا

تیرا ہی دھیان میری رگوں میں تھا موجزن
تیرا ہی عکس آئنۂ چشمِ تر میں تھا

لگتا ہے چھوڑ آیا ہوں فارِس وہیں کہیں
جاتے ہوئے تو دِل مرے رختِ سفر میں تھا

طلسم خانۂ امریکہ

"A journey is best measured in friends, rather than miles."

T. S. Eliot

ابر و گُل و ستارہ و مہتاب ساتھ تھے
نکلا مَیں گھر سے تو مرے احباب ساتھ تھے

رختِ سفر میں کچھ تو اُداسی تھی، کچھ گلاب
یعنی تمہاری یاد کے اسباب ساتھ تھے

رنگ و صدا کے دیس میں تنہا نہیں تھا مَیں
چنگ و رُباب و نغمہ و مضراب ساتھ تھے

ہر پل تھیں دائیں بائیں دِل آویز خوشبوئیں
ہر مرحلے پہ کچھ گلِ کمیاب ساتھ تھے

شہرِ طلسم و کوچۂ رنگ و نوا میں ہم
کھل کر جیے مگر ادب آداب ساتھ تھے

وحشت بھی ہم رکاب تھی، نشّہ بھی ہم قدم
یعنی غزالِ دشت و مئے ناب ساتھ تھے

خاکی بدن پہ کوئی بھی احساں نہیں لیا
حالانکہ لاکھ ریشم و کمخواب ساتھ تھے

روئے کسی کے دھیان میں تو روئے ٹوٹ کر
نکلے جب اشک تو کئی سیلاب ساتھ تھے

جب یاد کو پکارا، پکارا بصد اَدب
جب جب لیا وہ نام سب القاب ساتھ تھے

لوحِ جنوں پہ زیر و زَبر ہو گئے مگر
لکھّا جو لفظِ عشق تو اعراب ساتھ تھے

ہوتی ہے واپسی کے سفر میں یہ ٹُوٹ پُھوٹ
کچھ خواب پیچھے رہ گئے، کچھ خواب ساتھ تھے

فارس نے عجز چھوڑا نہیں شہرتوں میں بھی
اب بھی وہی ہیں ساتھ جو احباب ساتھ تھے

دل جیسی کوئی صورت دِلّی میں نظر آئی

"A man cannot discover new oceans unless he has the courage to lose sight of the shore."
Andre Gide

آنکھوں کے دریچوں سے دھڑکن میں اُتر آئی
دل جیسی کوئی صورت دِلّی میں نظر آئی

پہلے تو اُداسی سے دھندلائی رہیں آنکھیں
پھر آئے نظر غالب اور شام نکھر آئی

رات آئی تو کوچوں میں تھیں میر کی آوازیں
پھر آنکھ کہاں جھپکی، پھر نیند کدھر آئی

اُس شہر میں یوں کھویا، ہنستے ہوئے مَیں رویا
بیتی ہوئی صدیوں سے اپنوں کی خبر آئی

پہنچا تو تھا پورا مَیں، لَوٹا ہوں ادھورا مَیں
سو جسم تو لے آیا پر رُوح نہ گھر آئی

''دِلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی''

بیجنگ میں

"Blessed are the curious, for they shall have adventures."

Lovelle Drashman

دِلوں میں ہیں نہاں کیا کیا فسانے، کون جانے
کنوؤں کی تہ میں ہیں کتنے خزانے، کون جانے

نئی بستی کے شرق و غرب تو سب جانتے ہیں
نئے لوگوں کو جو دُکھ ہیں پُرانے، کون جانے

تُو چھان آئی ہے ساری کائناتی وسعتوں کو
تمنّا! تیرے آئندہ ٹھکانے کون جانے

کہیں ہے موت پر تالی، کہیں ہے بیاہ پر سوگ
رچایا ہے تماشا کیا خُدا نے، کون جانے

کہاں چُھپتا ہے جا کر عُمر سے بیتا ہُوا وقت
کدھر جاتے ہیں سب گزرے زمانے، کون جانے

اُدھر سے حُسن نکلا ہے، اِدھر سے عشق فارس
چلا ہے کون کس کو آزمانے، کون جانے

از کُجا می آید ایں آوازِ دوست؟

O

دُھوپ میں جیسے پھول ستارہ لگتا ہے
غصے میں تُو اور بھی پیارا لگتا ہے

مُفت میں ہم بدنام ہیں کوچۂ جاناں میں
کوئی بھی جائے، نام ہمارا لگتا ہے

اِس کے چہرے پر بھی داغ ہیں اشکوں کے
چاند بھی تیرے ہجر کا مارا لگتا ہے

ہجر کے حجرے کی تعمیر نہیں آسان
اس میں الگ ہی مٹی گارا لگتا ہے

ناممکن ہے بچنا ایک بھی دھڑکن کا
عشق میں دل سارے کا سارا لگتا ہے

وصل کی میٹھی لذت چکھ لینے کے بعد
ہجر ترا کچھ اور کرارا لگتا ہے

سینہ کھول کے دیکھوں تو کچھ پتہ چلے
دھڑکن سے تو دِل ناکارہ لگتا ہے

دروازے پر دستک اور ہوا کا شور
مجھے تو یہ رُخصت کا اشارہ لگتا ہے

اور کوئی دن ہے یہ میل ملن کا کھیل
دل کا میلہ کہاں دوبارہ لگتا ہے

لایا ہے تیری خوشبو، تیری یادیں
موسم بھی تیرا ہرکارہ لگتا ہے

پل پل رکھتا ہوں پلکوں کے پاس اِسے
آنسو مجھ کو آنکھ کا تارہ لگتا ہے

○

اِس سے پہلے کہ کوئی اِن کو چُرا لے، گِن لو
تم نے جو درد کیے میرے حوالے، گِن لو

چل کے آیا ہوں، اُٹھا کر نہیں لایا گیا مَیں
کوئی شک ہے تو مرے پاؤں کے چھالے، گِن لو

جب مَیں آیا تو اکیلا تھا، گِنا تھا تم نے
آج ہر سمت مِرے چاہنے والے گِن لو

مکڑیو ! گھر کی صفائی کا سمے آ پہنچا
آخری بار در و بام کے جالے گِن لو

زخم گننے ہیں اگر میرے بدن کے، یارو!
تم نے جو سنگ مِری سمت اُچھالے، گِن لو

خود ہی پھر فیصلہ کرنا کہ ابھی دن ہے کہ رات
شوق سے گن لو اندھیرے، پھر اُجالے گِن لو

اب نہیں کرتا کسی پر بھی بھروسہ کوئی
گر نہیں مجھ پہ یقیں، شہر میں تالے گِن لو

مے کدے میں کئی مشکوک سے لوگ آئے ہیں
اِن کو پلوا دو مگر اپنے پیالے گِن لو

تمہیں کرنا ہے گر احباب کی گنتی فارس
آستینوں میں چھپے، دودھ کے پالے گِن لو

○

اب یہاں سب کو محبت ہے، میاں!
اب مَیں چلتا ہوں، اجازت ہے میاں؟

عشق ہے، یہ کوئی مجبوری نہیں
دیکھ لو، جیسے سہولت ہے میاں!

مَیں یہاں تک تجھے لے آیا ہوں
اس سے آگے تری ہمت ہے میاں!

خیر تم نے تو کیا جو بھی کیا
اپنے دل پر مجھے حیرت ہے میاں!

ایک خیمہ ہے، مسافر ہم دو
اب فقط ایک ہی صورت ہے میاں!

کر تو سکتا ہوں جوابی حملہ
فکر یہ ہے کہ وہ عورت ہے میاں!

بچھڑے لوگوں کو مِلا دیتے ہو تم
ایک میری بھی محبت ہے میاں!

آپ کچھ اور سمجھ بیٹھے ہیں
ہنستے رہنا مری عادت ہے میاں!

کام ہو جائے گا، بیٹھو تو سہی
ایسی بھی کیا تمھیں عجلت ہے میاں!

تمھیں انکار تو ممکن ہی نہیں
لیکن اس وقت جو حالت ہے میاں!

اور کیا ہو گا بھلا کوئی ثبوت؟
تیرے چہرے پہ ندامت ہے میاں!

ہو گیا ہے تُو یہاں سے تو بری
ایک آگے بھی عدالت ہے میاں!

دیکھنے کی نہ جسارت کرنا
صرف چھونے کی اجازت ہے میاں!

کیوں شکاری سے ڈراتے ہو انہیں؟
ہرنیوں کی تو یہ فطرت ہے میاں!

بڑی مشکل سے ہُوا ہوں بے حس
اب سہولت ہی سہولت ہے میاں!

تم کہاں تاج لیے پھرتے ہو؟
اب فقیروں کی حکومت ہے میاں!

کیوں مجھے بانٹ رہے ہو سب میں
یہ امانت میں خیانت ہے میاں!

داستاں پھیل گئی ہے فارس
تم نہیں جانتے؟ حیرت ہے میاں!

○

سمجھ تو سکتے نہیں تُم نوائے خلقِ خدا
بنے ہو خیر سے فرماں روائے خلقِ خدا

سنو ! یہ ملکِ خدا ہے ، تمہارا تخت نہیں
کسی کا حق نہیں اِس پر سوائے خلقِ خدا

تمام خون خرابہ خدا کے نام پہ ہے
امان مانگنے کس در پہ جائے خلقِ خدا ؟

غضب خدا کا ، خداداد مملکت میں نہیں
ذرا سی جائے اماں بھی برائے خلقِ خدا

بھلے ہوں خوف کے پہرے ، بھلے ہو جبر کا راج
دبائے اب نہ دبے گی صدائے خلقِ خدا

بلند تخت زمیں بوس ہوگا آخرِکار
قبول ہو کے رہے گی دُعائے خلقِ خدا

اگرچہ ناوٗ بھنور میں ہے، تجھ کو فکر نہیں
خدا کا خوف کر ، اے ناخدائے خلقِ خدا !

امیرِ شہر تو ایسا نظام چاہتا ہے
کہ زخم کھائے مگر رو نہ پائے خلقِ خدا

اِسی سے مِلتی ہے آئندہ ساعتوں کی خبر
ندائے غیب ہے فارِس نوائے خلقِ خدا

O

جھجکتے رہنا نہیں ہے ادا محبت کی
سو ڈرتے ڈرتے اگر کی تو کیا محبت کی

میاں ! یہ سوچ کے کرنا خطا محبت کی
شکستِ دِل ہے کم از کم سزا محبت کی

گِنے چُنے ہوئے سینوں میں جھانکتا ہے یہ نُور
ہر ایک پر نہیں ہوتی عطا محبت کی

بہت حسین ہے تُو پھر بھی نا مکمل ہے
سو دے رہا ہوں تجھے مَیں دُعا محبت کی

تمہارے سامنے رکھی ہیں مَیں نے راہیں دو
سو ایک چُن لو ، محبت کی ؟ یا محبت کی ؟

تجھے مِلا تو مَیں سب اعتدال بھول گیا
سو ابتدا ہی سے بے انتہا محبت کی

نئے سرے سے مجھے بھا گیا، وہ جب بھی مِلا
سو ایک شخص سے مَیں بارہا محبت کی

کسی بھی اور صلے کی نہیں تلاش مجھے
محبت آپ ہے فارسؔ جزا محبت کی

○

خلعتِ خاک پہ ٹانکا نہ ستارہ کوئی
مَیں فقط مَیں ہی رہا، رُوپ نہ دھارا کوئی

مَیں محبت کے سِوا تیر نہ مارا کوئی
پھر بھی دُنیا ہو کہ دِل، جنگ نہ ہارا کوئی

توبہ، یکسانیتِ عشق کا عالم، توبہ
جان کو آنے لگا جان سے پیارا کوئی

عشق والو ! نہ مجھے کارِ جہاں سے روکو
مَیں اِسی راکھ سے ڈھونڈوں گا شرارہ کوئی

ہم کناری کی مجھے ڈال کے عادت فارس
کر گیا کتنی سہولت سے کنارہ کوئی

○

تجھ سے دُور آتے ہوئے جانا کہ یہ سب کیا ہے
دُکھ کسے کہتے ہیں اور درد کا مطلب کیا ہے

اُن کے دیکھے سے مجھے دولتِ ایمان ملی
میرے کافر! تری آنکھوں کے سوا رب کیا ہے

اُسے دیکھا نہ سنا تُم نے، تمھیں کیا معلوم
خوشبوئے چشم ہے کیا ، روشنیٔ لب کیا ہے

رات دن مذہب و مسلک پہ جھگڑنے والو !
مجھے سمجھاؤ کہ اللہ کا مذہب کیا ہے؟

لُطف ایسا تھا کہ مَیں بھول گیا اپنا نام
اُس نے جب پوچھا ترے نام کا مطلب کیا ہے؟

میرا ایمان تو یہ ہے کہ نہیں تجھ سا کوئی
اور اگر تجھ سا کوئی ہو بھی کہیں، تب کیا ہے؟

چل کسی روز کہیں بیٹھ کے سوچیں فارس
پہلے پہلے تو محبت تھی ہمیں، اب کیا ہے؟

O

میرا سکوت سُن، مِری گویائی پر نہ جا
آنکھوں کے حرف پڑھ، غزل آرائی پر نہ جا

اندر سے ٹوٹا پھوٹا ہوا ہوں مَیں رُوح تک
تُو میرے خدّوخال کی رعنائی پر نہ جا

دو چار دِن کے بعد بُھلا ڈالتے ہیں لوگ
دو چار دن کی جھوٹی پذیرائی پر نہ جا

یہ عارضی شکست ہے بنیاد فتح کی
میدانِ جنگ سے مِری پسپائی پر نہ جا

گر دیکھنے کی بات ہے تو پورے دِل سے دیکھ
اِن دھوکے باز آنکھوں کی بینائی پر نہ جا

آ بیٹھ عشق سیکھنے ہم پاگلوں کے بیچ
دانشورانِ شہر کی دانائی پر نہ جا

اِس گھٹتی بڑھتی ٹکیہ کو تُو گیند مت سمجھ
فارس ! مہِ تمام کی گولائی پر نہ جا

○

خود اپنے ہاتھ سے اپنا فسانہ لکھا ہے
سو کیسے تیروں جہاں ڈوب جانا لکھا ہے

حروف بھی ہیں لکیروں میں اور نقطے بھی
مری ہتھیلی پہ لفظِ خزانہ لکھا ہے

مجھے یہ فخر ہے، اے ساکنانِ عشقستان !
کہ مَیں نے آپ کا قومی ترانہ لکھا ہے

تری کہانی بدل دُوں گا ، کاتبِ تقدیر !
مَیں رو پڑوں گا جہاں مسکرانا لکھا ہے

کسی شریر نے مسجد کے داخلی در پر
جلی حروف میں کیوں بادہ خانہ لکھا ہے ؟

○

بس ایک جلوے کا ہوں سوالی، جنابِ عالی !
پڑا ہے دامانِ چشم خالی، جنابِ عالی !

ہماری آنکھوں کی حیرتیں ماند پڑ رہی ہیں
دکھایئے کوئی چھب نرالی، جنابِ عالی !

وہ آخری فیصلہ سُنا کر ہوئے روانہ
مَیں لاکھ چیخا، جنابِ عالی ! جنابِ عالی !

پہاڑ چُپ ہیں تو اِن کو بے بس نہ جانیے گا
پلٹ بھی سکتی ہے کوئی گالی، جنابِ عالی !

مجھے محبت نے مار ڈالا، حضورِ والا !
اسے سزا دیجے سخت والی، جنابِ عالی !

○

گر تمھیں شک ہے تو پڑھ لو مرے اشعار، میاں!
آگ سے عطر بناتا ہوں مَیں، عطّار میاں!

تمھیں لاکھوں کی طلب اور مرے بٹوے میں
گر بہت بھی ہوئے، ہوں گے یہی دو چار، میاں!

باغ سے تم نے چُرائے ہی نہیں آم کبھی
کیسے سمجھو گے تم اُس جسم کے اَسرار، میاں؟

مَیں کسی تیسرے لہجے میں تمھیں دُوں گا جواب
میری جانب سے ہے اقرار نہ انکار، میاں!

جن سے پہنچی ہے بہت خلقِ خدا کو راحت
کیوں بھلا جائیں گے دوزخ میں وہ کفار، میاں؟

رسیّاں بن کے پڑے رہتے ہیں ڈسنے کے لیے
دھیان رکھ، سانپ بھی ہوتے ہیں اداکار، میاں!

O

بے گھر ہوئیں تو گھر کی ضرورت نہیں رہی
چڑیوں کو پھر شجر کی ضرورت نہیں رہی

پہلی نظر میں یار مجھے حفظ ہو گیا
سو دوسری نظر کی ضرورت نہیں رہی

برسوں کی دوڑ دھوپ سے گھر تو بنا لیا
پھر یوں ہوا کہ گھر کی ضرورت نہیں رہی

رو دھو کے اِک دن آنسو مِرے خشک ہو گئے
پھر مجھ کو چشمِ تر کی ضرورت نہیں رہی

ڈر تو فقط یہی تھا کہیں کھو نہ جائے تُو
تُو کھو گیا تو ڈر کی ضرورت نہیں رہی

ویرانیوں کی ریت سے گھر بھر گیا مرا
صحراؤں کے سفر کی ضرورت نہیں رہی

اے زندگی! بھلا تجھے کیسے بتاؤں مَیں؟
تُو میری عمر بھر کی ضرورت نہیں رہی

○

لرزتے جسم کا بھونچال دیکھنے کے لیے
کب آؤ گے مری دھمّال دیکھنے کے لیے

چلی ہے دھیان کے جادونگر میں تیز ہوا
کسی پری کے کھلے بال دیکھنے کے لیے

چراغ لے کے مَیں پھرتا ہوں سرد گلیوں میں
ہوائے شب کے خدوخال دیکھنے کے لیے

چھڑک رہا ہوں تری پتّیوں پہ اپنا لہو
سفید پھول! تجھے لال دیکھنے کے لیے

سُنا ہے جان سے جانا ہے دیکھنا تجھ کو
نکل پڑا ہوں بہرحال دیکھنے کے لیے

یقین کر کہ تری اِک نگاہ کافی نہیں
ہماری حالتِ بے حال دیکھنے کے لیے

ہنسی ہنسی میں نکل آئے آنکھ سے آنسو
کسی کے ہاتھ میں رومال دیکھنے کے لیے

نگاہ چاہیے شفّاف پانیوں جیسی
وہ رُوئے آئنہ تمثال دیکھنے کے لیے

بڑھا رہا ہے ابھی لَو چراغِ بوسہ نما
ترے دمکتے ہوئے گال دیکھنے کے لیے

کہیں سے لائیے یادوں کا آئنہ فارس
ہمارے بیتے مہ و سال دیکھنے کے لیے

○

اِک تُو ہی نظر آئے ہے جس سمت نظر جائے
اے صُورتِ دلدار! کوئی بچ کے کدھر جائے

ہم نے تو سرِ دستِ دُعا رکھ دیے دونوں
اب چاہے ترے عشق میں دل جائے کہ سر جائے

اے خوگرِ گریہ! کوئی پل دم بھی لیا کر
آنکھوں کا یہ پانی کہیں سر سے نہ گذر جائے

تقدیر جو بگڑی ہے تو کچھ وقت لگے گا
یہ زُلف نہیں ہے کہ سنوارو تو سنور جائے

یکسانیتِ عشق! وہ محبوب کہیں ڈھونڈ
جو روز کرے عہدِ وفا، روز مکر جائے

کچھ ہے جو اِسے تیری طرف کھینچ رہا ہے
ورنہ یہ نظر اور کہیں بارِ دگر جائے ؟

کیا راہ نکالی ہے زمانے نے کہ ہر شخص
آئے، مجھے دیکھے، مجھے ٹھکرائے، گذر جائے

اِک عشق سرائے ہے مرا دل سو حسینو !
جس جس کو ٹھہرنا ہو بِنا دام ٹھہر جائے

رنگین مزاجی کی بھی ہوتی ہے کوئی حد
فارس ! دلِ آوارہ سے کہہ دو کہ سُدھر جائے

ایک شعر

روتا ہوں تری کھوئی ہوئی یاد کے دُکھ میں
جیسے کوئی ماں روتی ہو اولاد کے دُکھ میں

O

مِری شہ رگ ہے، کوئی عام سی ڈوری نہیں ہے
تمہارا غم مِری طاقت ہے، کمزوری نہیں ہے

انا کو بیچ میں لانے سے پہلے سوچ لینا
محبت عاجزی ہے، کوئی منہ زوری نہیں ہے

ٹہلنے باغ میں آتے ہو جس نیّت سے تم لوگ
میاں! وہ حوّا خوری ہے، ہوا خوری نہیں ہے

بھلے تم ہاتھ کاٹو یا مِری گردن اُڑا دو
مگر یہ دِل کی چوری تو کوئی چوری نہیں ہے

بڑے گُن ہیں بچاری میں مگر مِلتا نہیں بر
سلیقہ ور ہے، سگھڑ ہے مگر گوری نہیں ہے

○

شہرِ بے رنگ میں کب تجھ سا نرالا کوئی ہے
تجھ کو دیکھوں تو لگے عالمِ بالا کوئی ہے

کبھی گُل ہے، کبھی خوشبو، کبھی سورج، کبھی چاند
حُسنِ جاناں ! ترا اپنا بھی حوالہ کوئی ہے؟

ہاتھ رکھ دِل پہ مِرے اور قسم کھا کے بتا
کیا مِری طرح تجھے چاہنے والا کوئی ہے ؟

رونا آتا ہے تو یوں تیری طرف دوڑتا ہوں
جیسے تجھ پاس مِرے غم کا ازالہ کوئی ہے

آخرِ شب کا سماں، قریۂ ہجر، ایک صدا
کوئی ہے؟ میرے لیے جاگنے والا کوئی ہے ؟

ٹیس اُٹھتی ہے عجب جونہی قدم اُٹھتے ہیں
پاؤں میں ہو کہ نہ ہو، رُوح میں چھالا کوئی ہے

بے سبب تو نہیں لفظوں میں یہ وحشت فارس
ہو نہ ہو آپ کی غزلوں میں غزالہ کوئی ہے

ایک شعر

ایک انگڑائی مرے سامنے لہرانے لگی
آیتِ احسنِ تقویم سمجھ آنے لگی

○

خدا نے تول کے گوندھے ہیں ذائقے تم میں
تمہارے جسم میں شہد اور نمک برابر ہے

وہ حُسن تم کو زیادہ دِیا ہے فطرت نے
جو حُسن پھول سے مہتاب تک برابر ہے

ہر ایک صحن میں تو چاندنی چھٹکتی نہیں
جمالِ یار پہ کب سب کا حق برابر ہے

تمہارا چہرہ مجھے یاد ہو گیا ہے سو اب
دکھاؤ یا نہ دکھاؤ جھلک، برابر ہے

○

عشق سچا ہے تو کیوں ڈرتے جھجکتے جاویں
آگ میں بھی وہ بُلائے تو لپکتے جاویں

کیا ہی اچھا ہو کہ ،گر یہ بھی چلے ، سجدہ بھی
میرے آنسو ترے پیروں پہ ٹپکتے جاویں

تُو تو نعمت ہے سو شُکرانہ یہی ہے تیرا
پلکیں جھپکائے بِنا ہم تجھے تکتے جاویں

دَم ہی لینے نہیں دیتے ہیں ترے خدّوخال
دم بہ دم اور ذرا اور دمکتے جاویں

توڑنے والے کسی ہاتھ کی امید پہ ہم
کب تلک شاخِ غمِ ہجر پہ پکتے جاویں؟

شِیر خواروں کے سے بے بس ہیں ترے عشق میں ہم
بول تو سکتے نہیں، روتے بلکتے جاویں

اُس کے رُخسار بھی شعلوں کی طرح ہیں، یعنی
دہک اُٹھیں تو بہت دیر دہکتے جاویں

عشق زادوں سے گذارش ہے کہ جاری رہے عشق
بکنے والوں کو تو بکنا ہے سو بکتے جاویں

فارس اِک روز اِسی عطر سے مہکے گا وہ شخص
آپ چُپ چاپ فقط جان چھڑکتے جاویں

○

طاقِ نسیاں سے اُتر، یاد کے دالان میں آ
بھولے بسرے ہوئے اے شخص! مرے دھیان میں آ

عین ممکن ہے کہ ہو جائے جو ناممکن ہے
تُو کسی روز مرے حلقۂ امکان میں آ

آج کے بعد اگر آیا تو کیا آیا تُو
تجھ کو آنا ہے مری جان تو اِس آن میں آ

یار تاخیر سے آئے ہیں مگر آ تو گئے
زندگی! پھر سے مرے پیکرِ بے جان میں آ

حیرت سرائے

بارش بھری رات

شاخِ شب پر کوئی مہتاب شگوفہ پھوٹا
اور مہک پھیل گئی سرمئی خاموشی کی
آسماں سے کوئی بے نام ستارہ ٹوٹا
نیم خوابیدہ شجر نے کوئی سرگوشی کی

چاند خاموش تھا، یک لخت صدا دینے لگا
کروٹیں لیتی ہوا نیند سے بیدار ہوئی
وقت یک دم کسی آہٹ کا پتہ دینے لگا
دامنِ کوہ سے بدلی سی نمودار ہوئی

گھور گھنگھور گھٹا لائی گھنیرے بادل
مہرباں پانی گلی کوچوں میں ٹپ ٹپ ٹپکا
دل کے اس پار ہوئی کوئی عجب سی ہلچل
اور رگ و پے میں تری یاد کا کوندا لپکا

حیرت

اُس کو دیکھ کے میری آنکھیں ایسی تھیں
جیسے صحراؤں کے پالے بچے نے
پہلی پہلی بار سمندر دیکھا ہو

ایک شعر

ہر شخص نے جشنِ لب و رُخسار منایا
اور ہم نے ترے ہجر کا تہوار منایا

وہ عجیب خانہ بدوش تھا

وہ عجیب خانہ بدوش تھا
سرِ شام ناقۂ عشق پر مرے دل کے گاؤں میں آ گیا
تو کچھ ایسی مست ہوا چلی
کہ گلی گلی
میں ہزاروں پھول مہک اُٹھے
مرے اونگھتے ہوئے بام و در بھی چہک اُٹھے
مجھے یوں لگا
کہ پلک جھپکتے ہزاروں سال گذر گئے
مگر اُس سمے کسے ہوش تھا کہ سرکتے وقت کو روکتا
کسے ہوش تھا

وہ عجیب خانہ بدوش تھا
سرِ شام چپکے سے آ گیا
مگر اس سے پہلے کہ چاندنی مرے گھر کے صحن میں جھانکتی
وہ چلا گیا

سالگرہ

سو آج سلسلۂ روز و شب وہیں پہنچا
جہاں سے کربِ مسلسل کی ابتدا ہوئی تھی
اُسی مقام پہ آ نکلا پھر سے جادۂ وقت
جہاں حیات ترے غم سے آشنا ہوئی تھی
یہی وہ موڑ تھا جس پر جنوں بنا مرا دوست
اسی پڑاؤ پہ مجھ سے خوشی خفا ہوئی تھی

بفیضِ گردشِ دوراں ہوا جو حال ہوا
مگر یہ سوچ کے دل کو بہت ملال ہوا
کہ تجھ سے بچھڑے ہوئے آج ایک سال ہوا

زیادہ پاس مت آنا

مَیں وہ تہ خانہ ہوں جس میں
شکستہ خواہشوں کے اَن گنت آسیب رہتے ہیں
جو آدھی شب تو روتے ہیں، پھر آدھی رات ہنستے ہیں
مری تاریکیوں میں
گمشدہ صدیوں کے گرد آلود، نا آسودہ خوابوں کے
کئی عفریت بستے ہیں
مری خوشیوں پہ روتے ہیں، مرے اشکوں پہ ہنستے ہیں
مرے ویران دل میں رینگتی ہیں مکڑیاں غم کی
تمناؤں کے کالے ناگ شب بھر سرسراتے ہیں
گناہوں کے جنے بچھو
دُموں پر اپنے اپنے ڈنک لادے
اپنے اپنے زہر کے شعلوں میں جلتے ہیں

یہ بچھو دُکھ نگلتے اور پچھتاوے اُگلتے ہیں

زیادہ پاس مت آنا
مَیں وہ تہہ خانہ ہوں جس میں
کوئی روزن کوئی کھڑکی نہیں باقی
فقط قبریں ہی قبریں ہیں
کہیں ایسا نہ ہو تم بھی انہی قبروں میں کھو جاؤ
اِنہی میں دفن ہو جاؤ
گلابی ہو، کہیں ایسا نہ ہو تم زرد ہو جاؤ
محبت کی حرارت کھو کے بالکل سرد ہو جاؤ
سراپا درد ہو جاؤ

سو میرے سادہ و معصوم! مجھ کو راس مت آنا
زیادہ پاس مت آنا

نیلی جھیل کنارے ہے اُس بھید بھری کا گاؤں

نیلی جھیل کنارے ہے اُس بھید بھری کا گاؤں
جس کے خدّوخال میں چمکے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں
رُوپ سروپ سراپا کندن، کیا ماتھا، کیا پاؤں

عشق کی کومل تال پہ ہم تھے کتنے مست مگن
رنگ، بہار، گلاب، پرندے، چاند، شراب، پوَن
سانولی سُندرتا کی دُھن میں گم تھے تن مَن دھن

وقت پھر آگے ایسا آیا، پیچھے پڑ گئے لوگ
آنکھ جھپکتے کھو گیا سب کچھ، باقی رہ گیا سوگ
چاٹ گیا ساری خوشیوں کو ہجر کا ظالم روگ

یاد کی سبز مُنڈیر پہ چمکیں اُس کے نین چراغ
رنگ برنگ لگا ہے دِل پر زخموں کا اِک باغ
ربط کی ڈور کہاں سے ٹوٹی، ملتا نہیں سراغ

شام ڈھلے جب ہو جاتی ہے دِل بستی ویران
سانسیں گم صم، دھڑکن چپ چپ اور آنکھیں سنسان
گھور اندھیری رات میں چمکے اس پگلی کا دھیان

اے سراپا غزل کی رعنائی !

○

بہت ہی خوش ہوں کہ پیاروں سے ہو کے آیا ہوں
مَیں رفتگاں کے مزاروں سے ہو کے آیا ہوں

مَیں شہرِ وصل میں آسان تو نہیں پہنچا
جنوں کی راہگذاروں سے ہو کے آیا ہوں

یہ اور بات کہ لگتا ہے تُو ہی پہلا ہے
مَیں تیرے پاس ہزاروں سے ہو کے آیا ہوں

پہنچ گیا ہوں تو اب سُن ہی لے مری عرضی
بڑی طویل قطاروں سے ہو کے آیا ہوں

غزل سرائے، چمن زار، مے کدہ ، صحرا
تری تلاش میں چاروں سے ہو کے آیا ہوں

اسی لیے ہے مرے پانیوں میں شیرینی
مہکتے میٹھے دیاروں سے ہو کے آیا ہوں

کچھ اس لیے بھی پرندے مجھے سراہتے ہیں
مَیں خاک زاد ستاروں سے ہو کے آیا ہوں

تمہیں مَیں دیکھ کے پلٹوں تو ایسا لگتا ہے
کہ مَیں اجنتا کے غاروں سے ہو کے آیا ہوں

○

کوئی میرے اشک پونچھے، کوئی بہلائے مجھے
یُوں نہ ہو لوگو اُداسی راس آجائے مجھے

عشق نے ایسے سُہانے رنگ پہنائے مجھے
گُل تو گل ہیں، چاند تارے دیکھنے آئے مجھے

ربِّ گریہ بخش! تجھ کو آنسوؤں کا واسطہ
دیکھ، کافی ہو چکی، اب عشق ہو جائے مجھے

کیا خبر اُس کے پلٹنے تک مرا کیا حال ہو
اُس سے کہنا جاتے جاتے دیکھتا جائے مجھے

جیسے اک تصویر سے ہو جائے وا البم تمام
تُو مِلا تو سب پُرانے دوست یاد آئے مجھے

مَیں بفیضِ عشق روشن صُورتِ مہتاب ہُوں
جس کسی میں دم ہو، آئے اور گہنائے مجھے

درمیانہ قد ہے، آنکھیں نم ہیں، فارس نام ہے
جس کسی کو بھی ملُوں، صحرا میں چھوڑ آئے مجھے

O

عید پھیکی لگ رہی ہے، عشق کی تاثیر بھیج
آ گلے مِل یا لباسِ عید میں تصویر بھیج

تیری خوشبو اور کھنک مَیں خط سے کر لوں گا کشید
چوڑیوں والے حنائی ہاتھ کی تحریر بھیج

میری آنکھوں کو نہ دے آدھی ادھوری بخششیں
خواب واپس چھین لے یا خواب کی تعبیر بھیج

جاں لبوں پر آ گئی ہے آنسوؤں کے قحط سے
آنکھ بھوکی مر رہی ہے، غم کے شہد و شِیر بھیج

دیکھ کر ویران گلیاں خوف آتا ہے مجھے
اے خدا ! کوئی گداگر یا کوئی رہگیر بھیج

عید کا تحفہ یہ کہہ کر اُس نے واپس کر دیا
میرے پیروں کے لیے پائل نہیں، زنجیر بھیج

تیری لکھّی قید سے باہر نکلنا ہے مجھے
کاتبِ تقدیر ! ایسا کر، کوئی تدبیر بھیج

دوسرے مصرعے کے گہرے راز کو فارس نہ کھول
اِس غزل کو چپکے چپکے وادیٔ کشمیر بھیج

○

دیدۂ خشک آج بھر آیا
ہجر کے پیڑ پر ثمر آیا

کوئی صورت نظر نہ آتی تھی
پھر اچانک ہی تُو نظر آیا

گرچہ سارا قصور تیرا تھا
سارا اِلزام میرے سر آیا

پہلے میں رُک کے دیکھتا تھا اُسے
آج دیکھے بِنا گُزر آیا

مَیں تو لوٹ آیا لیکن اپنا آپ
اُس کی دہلیز پر ہی دھر آیا

ہو گئی ختم میری دربدری
راہ میں ایک ایسا گھر آیا

دو شعر

پسماندگانِ عشق کی ڈھارس بندھائی جائے
جشنِ شکستِ دل ہے، مئے سرخ لائی جائے

سیراب ہونٹ کیسے کہیں تشنگی پہ شعر ؟
سو پہلے اِن کو پیاس کی لذت چکھائی جائے

○

نہ پھول کی نہ کسی نافۂ غزال کی ہے
سخن کے دشت میں خوشبو ترے خیال کی ہے

مَیں تجھ کو دیکھ کے ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں
پرائی چیز سہی ، چیز تُو کمال کی ہے

ترا نہ ہونا بھی اب تو ہے تیرے ہونے سا
فراق میں بھی مری کیفیت وصال کی ہے

نہ دیکھ بالکنی سے غروب کا منظر
جمالِ یار! سنبھل، یہ گھڑی زوال کی ہے

نگاہِ یار بھلے بے نیاز ہو فارس
نگاہِ یار ہی محرم تمہارے حال کی ہے

○

اکڑتا پھرتا ہوں مَیں جو سارے جہاں کے آگے
تو راز یہ ہے کہ روز جھکتا ہوں ماں کے آگے

وہ ٹال دیتا ہے ایک سُورج کی اشرفی پر
اگرچہ روتا ہوں رات بھر آسماں کے آگے

ہوا چلی ، بال اُڑے، دکھائی دِیا وہ ماتھا
بزرگ بھی جُھک گئے پھر اُس نوجواں کے آگے

سکوت اُس کا بلیغ تر تھا مرے سخن سے
سو ہو گیا مَیں تو گنگ اُس خوش بیاں کے آگے

مجھے بتا دی گئی ہے آئندگاں کی قسمت
سو روز روتا ہوں خواب میں رفتگاں کے آگے

○

لے آنکھ موند لی دمِ دیدار ، اَور حکم ؟
اے پردہ داریٔ لب و رُخسار ! اَور حکم ؟

فرماں تھا آپ کا کہ کروں اپنی سرزنش
میں سر ہی کاٹ لایا ہوں ، سرکار ! اور حکم ؟

پہلو میں چاند لایا ہوں ، شیشے میں چاندنی
آوارگانِ قریۂ بیدار ! اَور حکم ؟

تُو نے دِیا تھا حکم کہ مَیں جینا چھوڑ دوں
تعمیل ہو چکی ہے مرے یار ! اَور حکم ؟

ضد تھی تری کہ کھل کے بتاؤں مَیں دل کی بات
سو کردیا ہے عشق کا اظہار ، اَور حکم ؟

لیں ، رکھ دیے ہیں آپ کی پاپوشِ پاک پر
دلق و گلیم ، خرقہ و دستار ، اَور حکم ؟

○

یہی دُعا ہے، یہی ہے سلام، عشق بخیر
مرے سبھی رُفقائے کرام ! عشق بخیر

دیارِ ہجر کی سُونی اُداس گلیوں میں
پکارتا ہے کوئی صبح و شام، عشق بخیر

سرک گیا جو ذرا خواب گاہ کا پردہ
فلک سے بول اُٹھا ماہِ تمام عشق بخیر

مَیں کر رہا تھا دُعا کی گزارشیں اُس سے
سو کہہ گئی ہے اُداسی کی شام، عشق بخیر

بڑے عجیب ہیں شہرِ جنوں کے باشندے
ہمیشہ کہتے ہیں بعد از سلام عشق بخیر

اُفق کے پار مجھے یاد کر رہا ہے کوئی
ابھی مِلا ہے اُدھر سے پیام : عشق بخیر

بُلاوا آ گیا میرا، مجھے اجازت دیں
جنابِ خضر علیہ السلام ! عشق بخیر

یہ رہ ضرور تُمہارے ہی گھر کو جاتی ہے
لکھا ہوا ہے یہاں گام گام عشق بخیر

بیان کی ہے غزل وار داستانِ عشق
سو اِس کتاب کا رکھا ہے نام عشق بخیر

اگر پیوں گا تو آداب ہی بدل دوں گا
کہوں گا جام سے ٹکرا کے جام، عشق بخیر

○

جاہ و حشم نہ لعل و جواہر کی بات ہے
انعامِ عشق صرف مقدر کی بات ہے

جس وقت چاہو، اُٹھ کے مرے دِل میں آ رہو
چھوڑو تکلّفات میاں ! گھر کی بات ہے

پھیلا تو پھیلتا ہی گیا لمحۂ فراق
تُو نے تو کہہ دیا تھا کہ پل بھر کی بات ہے

عالم پناہ ! عشق پہ چلتا نہیں ہے زور
یہ تو خطا مُعاف ، مقدر کی بات ہے

مت پوچھ مَیں نے عشق پہ کیوں جان وار دی
دُنیا ! یہ تیری سوچ سے اُوپر کی بات ہے

فارس تُو چاہے لاکھ بہانے بنا مگر
ہم خوب جانتے ہیں جو اندر کی بات ہے

○

اِس لیے بھی دُعا سلام نہیں
اُن کو فی الحال مُجھ سے کام نہیں

ہوگیا دِل پہ یار کا قبضہ
اب یہ جاگیر میرے نام نہیں

یُوں نہ دُھتکاریے مجھے، صاحب !
مَیں گدا ہوں، کوئی غلام نہیں

خاص رستہ ہے، دیکھ کر چلیے
دل مرا شاہراہِ عام نہیں

تُو میاں اتنی دوڑ دھوپ نہ کر
حُسن کیا، عشق کو دوام نہیں

اُس کی آنکھیں کلام کرتی ہیں
اِس میں فارس کوئی کلام نہیں

○

سر بسر آنسو، مکمل غم ہوں مَیں
آپ اپنے حال کا ماتم ہوں مَیں

مجھ سے بڑھ کے کس نے جانا ہے تمہیں؟
اور تم کہتی ہو نا محرم ہوں مَیں

ایسے یکجا ہیں، سمجھ آتی نہیں
مجھ میں ضم ہے تُو کہ تجھ میں ضم ہوں مَیں

ٹھوکروں کے نیل ہیں مجھ پر سو اب
عام سا پتھر نہیں، نیلم ہوں مَیں

اک نظر سے ہی فنا ہو جاؤں گا
تُو ہے سورج، قطرۂ شبنم ہوں مَیں

چھوڑ جا لیکن مجھے سمجھا کے جا
تیری اُمّیدوں سے کیسے کم ہوں مَیں ؟

میرے دُکھ کا کون اندازہ لگائے
مسکرانے والی چشمِ نم ہوں مَیں

غور سے تو دیکھیے ، جانِ بہار!
آپ کا گزرا ہوا موسم ہوں مَیں

ظلم کرنے والے بے دَم ہو گئے
صبر کی رحمت سے تازہ دَم ہوں مَیں

اس لیے روندا گیا پیروں تلے
لشکرِ ناکام کا پرچم ہوں مَیں

چھین لیں جس سے کسی نے دھڑکنیں
اُس دلِ خاموش کی سرگم ہوں مَیں

فالتو مت جانیے فارس مجھے
زندگی کے زخم کا مرہم ہوں مَیں

○

وہ رات میاں رات تھی ایسی کہ نہ پوچھو
پہلی ہی ملاقات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

پانی ہی نہیں، آگ بھی تھی اُس کی پُجارن
اُس بُت میں کوئی بات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

انگ انگ میں وہ رنگ کہ ہوتی تھی نظر دنگ
آنکھوں کی مدارات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

حیرت کو بھی حیرت تھی کہ دیکھے بھی تو کیا کیا
نظّاروں کی بہتات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

شب بھر میں گدا سے مَیں ہوا بادشہِ عشق
کشکول میں خیرات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

آنکھوں سے مسلسل تھے رواں اشک خوشی کے
تاروں کی وہ برسات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

کیا مجھ سے محبت ہے؟ محبت ہے تو کتنی؟
وہ محوِ سوالات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

کانوں میں کہی وقتِ سحر اُس نے کوئی بات
اُس بات میں اِک بات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

وہ پوچھ رہی تھی کہ سکُوں کی کوئی صورت؟
اور صورتِ حالات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

دِل ہار گیا پھر بھی اُسے جیت گیا مَیں
وہ جیت بھری مات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

تھی وقتِ تہجد مری اور اُس کی ہتھیلی
فارس! وہ مُناجات تھی ایسی کہ نہ پوچھو

○

گر چاہتے ہو حسرتِ ناکام دیکھنا
بجھتے دیے کی لَو کو سرِشام دیکھنا

تھوڑی ہے زندگی مگر آغاز تو کرو
لازم نہیں ہے عشق کا انجام دیکھنا

مَیں سجدہ ریز ہُوں، مرے مسلک میں ہی نہیں
چوکھٹ سے سر اُٹھا کے سرِ بام دیکھنا

مَیں تو وہاں بھی سب سے زیادہ ہوں کسمپرس
فہرستِ بے کساں میں مرا نام دیکھنا

فی الحال کر لو جتنی بھی تذلیل کر سکو
اک روز میرے عزت و اِکرام دیکھنا

جس لب کو چوم چوم کے تھکتے نہیں تھے تم
اُس لب سے خود کو موردِ الزام دیکھنا

کوئی تو ہے جو پھیرتا رہتا ہے سب کے دن
لوگوں کے بیچ گردشِ ایام دیکھنا

کرتا نہیں قبول کوئی رِندِ یار باش
محفل میں دوستوں کے بِنا جام دیکھنا

تعریف کوہ قاف کی اپنی جگہ مگر
فرصت نکال کر کبھی کالام دیکھنا

چکر لگے جو شہرِ خموشاں کے باغ کا
فارس وہاں سکوت کا کہرام دیکھنا

○

حُسن کو عیب سے خالی نہ سمجھیے، صاحب !
دیکھیے، خود کو مثالی نہ سمجھیے، صاحب !

در پہ آیا ہوا درویش بھی ہو سکتا ہے
در پہ آئے کو سوالی نہ سمجھیے، صاحب !

عین ممکن ہے کہ اِک روز مَیں اُڑنے لگ جاؤں
خوف کو بے پر و بالی نہ سمجھیے، صاحب !

خود پہ گذری ہے تو یہ شعر کہے ہیں مَیں نے
اِن خیالوں کو خیالی نہ سمجھیے، صاحب !

○

ثبوت کوئی نہیں ہے، گواہ کوئی نہیں
گناہگارو ! تمہارا گناہ کوئی نہیں

فصیل و بام نہ دیوار و در نہ بندِ قبا
نگاہِ عشق میں حدِّ نگاہ کوئی نہیں

ترے بدن سے مرے دل تلک ہیں خواب ہی خواب
مگر ہمارے لیے خوابگاہ کوئی نہیں

ہماری خاک کرے گی سفر ستارہ وار
ہماری آخری آرام گاہ کوئی نہیں

پھر ایک دن کہا آدم نے اپنی حوّا سے
یہ پہلا بوسہ ہے، اس کا گناہ کوئی نہیں

کسی سے ایسا تعلق بنا لیا ہے کہ اب
کسی بھی اور تعلق کی چاہ کوئی نہیں

یہ مملکت ہے محبت کی، سو یہاں مِرے دوست !
سبھی غلام ہیں اور بادشاہ کوئی نہیں

مجھے یہ کہنا نہیں چاہیے مگر فارس
مرے علاوہ مرا خیر خواہ کوئی نہیں

دو شعر

غیروں کو مِل گیا ہے بڑے کام کا خُدا
اپنا خُدا تو نکلا فقط نام کا خُدا

حد ہے، خُداؤں کے بھی ہیں اوقاتِ کار کیا؟
یہ صبح کا خُدا ہے تو وہ شام کا خُدا

انگور سے پہنچا تھا نہ انجیر سے پہنچا

انگور سے پہنچا تھا نہ انجیر سے پہنچا
رس رُوح تلک بوسے کی تاثیر سے پہنچا

پھر مُند گئیں دروازے کو تکتی ہوئی آنکھیں
پیغام رساں تھوڑی سی تاخیر سے پہنچا

عجلت میں پڑے لڑکو ! سُنو میری کہانی
مَیں عشق تلک صبر کی تدبیر سے پہنچا

قیدی کے خطوں پر بڑے پہرے تھے لہٰذا
پیغام مٹائی ہوئی تحریر سے پہنچا

وہ گھاؤ ہے گہرا کہ جو پہنچا ہے زباں سے
اُس زخم کی نسبت کہ جو شمشیر سے پہنچا

آنکھوں سے تو ٹپکے گا جو دُکھ اندھے گدا کو
اک گالیاں دیتے ہوئے رہگیر سے پہنچا

پہنچی مرے دِل تک تری آواز کی تاثیر
پھر مَیں ترے در تک اُسی تاثیر سے پہنچا

ثروت ہو کہ اظہار ہو، تابش ہو کہ جاذب
فارس ! انہیں سب فیضِ سخن میر سے پہنچا

سبز کھجوروں کی قطار

تعارُف

نواحِ شہر کے اُونچے پہاڑوں میں
جو خوشیاں چار سُو اُڑتی ہیں
اُن کا نام بادل ہے

حریمِ صبح اور میخانۂ شب میں
جو بے آواز رقصاں ہے،
وہ خوشبو ہے

مہکتی ڈولتی شاخوں پہ
رنگ و بُو کے جو چھینٹے نمایاں ہیں
اُنہیں ہم پھول کہتے ہیں

اور ان پھولوں، پہاڑوں، وادیوں، رنگوں،
ہواؤں، خوشبوؤں اور شاخچوں کے درمیاں
جو ایک دیوانہ تمہیں پل پل صدا دیتا ہے
اُس کا نام فارس ہے

سالِ نَو

جس حال میں تم رکھو وہی حال مبارک
ہم اہلِ محبت کو نیا سال مبارک

ہر دل کو ہو منہ مانگی تمناؤں کا مژدہ
ہر آنکھ کو من چاہے خدوخال مبارک

ہر پھیلی ہتھیلی کی دعاؤں کو دعائیں
ہر پاؤں کو منزل کی طرف چال مبارک

یخ بستہ شبِ ہجر کی برفیلی ہوا میں
مجھ کو ترا غم، تجھ کو تری شال مبارک

ہر چند تجھے اُس نے فقط درد دیے ہیں
فارس تجھے یہ عشق بہرحال مبارک

شکایت

(مشال خان کا نوحہ)

مری دُہائی سُنیں ، اے محمدِ عربیؐ !
مَیں پیاسا قتل ہوا ، ہائے میری تشنہ لبی
حضورؐ ! مَیں نے نہیں کی تھی کوئی بے ادبی
مری تو چیخیں بھی سب رہ گئیں دبی کی دبی

بغیر جرم اذیت کے گھاٹ اُتارا گیا
حضورِ والاؐ ! مجھے بے قصور مارا گیا

حضورؐ ! عرض سنیں ماں کی زندگی تھا مَیں
ضعیف باپ کی آنکھوں کی روشنی تھا مَیں
بہن کے دل کا سکوں ، بھائی کی ہنسی تھا مَیں
حضورؐ ! آپ کا معصوم اُمتی تھا مَیں

تو پھر یہ ظلم و ستم کس لیے ہُوا ، مولا ؟
کوئی دوا ، کوئی مرہم، کوئی دُعا ، مولا ؟

حضورؐ! آپؐ تو رحمت ہیں دو جہاں کے لیے
جلائے آپؐ نے ہر سُو محبتوں کے دِیے
جنابؐ ! آپؐ ہمیشہ رحیم بن کے جیے
مگر جنابؐ کی اُمت نے مجھ پہ ظلم کیے

حضورؐ! مَیں نے پڑھا تھا سبھی صحائف میں
کہ آپؐ نے تو دُعا دی تھی سب کو طائف میں

حضورؐ! آپؐ نے دشمن کو بھی دُعائیں دیں
عدوئے جاں کو بھی چاہت بھری صدائیں دیں
جفائیں سہہ کے بھی ہر شخص کو وفائیں دیں
جنہوں نے کانٹے بچھائے، انہیں قبائیں دیں

سو مَیں نے آپؐ کی سنت کا اعتراف کیا
گواہ رہیے کہ مَیں نے اِنہیں معاف کیا

نگاہ کیجیے خدارا ! مِرے عظیم نبیؐ !
مِرے یتیموں کے سینے، مِرے یتیم نبیؐ !
مِرے وطن پہ کرم ہو، مِرے کریم نبیؐ !
مِرے شفیق محمدؐ ! مِرے رحیم نبیؐ !

بنامِ دین کسی طور کوئی قتل نہ ہو
کہ مَیں تو قتل ہوا، اور کوئی قتل نہ ہو

عرضی

موسمِ لالہ و گُل!
قسم ہے تجھے
اپنے پھولوں میں سب سے حسیں پھول کی
موسمِ لالہ و گُل!
تجھے واسطہ
اپنے رنگوں میں سب سے جواں رنگ کا
اب کے سامانِ عیش و مسرّت کی تقسیم کرتے ہوئے
ہر کسی کو خوشی ایک سی بانٹنا
رنگ و خوشبو سبھی کو برابر ملیں

اے نقیبِ طرب!
خوش گلو ساعتیں جب کریں ابتدا جشنِ صوت و صدا
بے نواؤں کے بارے میں بھی سوچنا

جن کے خاموش لب منتظر ہیں قرن ہا قرن سے
کہ اذنِ تکلّم ملے
اے سفیرِ جنوں!
نکہتوں کے خزانے لُٹاتے ہوئے
اُن گداؤں کے بارے میں بھی سوچنا
جن کا خوشبو سے اب تک تعارف نہیں

ساقیٔ بزمِ یاراں!
شرابِ جنوں خیز رِندوں میں تقسیم کرتے ہوئے
تشنہ لب نامرادوں کو بھی پوچھنا
جن کے ہونٹ العطش العطش کہتے کہتے فنا ہوگئے
خلعتوں پر شگوفے سجاتے ہوئے
چیتھڑوں اور دریدہ گریبان والوں کو بھی دیکھنا
روشنی کے خزانے لُٹاتے ہوئے
کسمپرسوں، بُروں، کم نصیبوں، غریبوں میں بھی بانٹنا
دیکھنا، کوئی جھولی نہ خالی رہے

دیکھنا، حُسن سب کو برابر ملے
اور اِن سب کے صدقے مجھے نعمتِ حرف وافر ملے

عائشہ، علینہ، عائلین، دُعا اور عائسل کیلئے

کبھی وہ وقت نہ آئے جو تجھ کو راس نہ ہو
خدا کرے کہ ترا دل کبھی اُداس نہ ہو
رہے نہ تشنۂ تعبیر کوئی خواب ترا
کوئی کسک نہ ہو، کوئی ادھوری آس نہ ہو
ہمیشہ لطف و طرب تیرے اردگرد رہیں
کوئی بھی لمحۂ غم تیرے آس پاس نہ ہو
تری دعاؤں پہ برسے قبولیت کی پھوار
تری بڑی بڑی آنکھوں میں کوئی یاس نہ ہو
خُدا کرے کہ تری زندگی سے دور رہے
ہر ایسا شخص کہ جو تیرا غم شناس نہ ہو

تری جبیں پہ سدا مہربان نور رہے
اندھیرا تیری نظر سے ہمیشہ دور رہے

بِپتا سجنی کی

گھِر گھِر آئے پگلے بادل، برسی میگھا سانوری
گائے پپیہا، ناچے پُروا، کُوکے کوئل بانوری

مَیں بِرہا کی ماری ناری سپنے دیکھوں پریت کے
کجرارے نینوں میں دمکیں تیور گھبرو میت کے

بستی بستی پیٹ ڈھنڈورا، او ری سکھی من موہنی !
کرشن پیا کی دُوری سے ادھ مَوئی ہے رادھا سوہنی

موہے ساجن ! مانگ میں جب سیندور نہیں ترے نام کا
چھاپ، تِلک ، پائل، نتھلی ، چوڑی، کنگنا کس کام کا

جھونکے لائی دُور سے پُروا ساجن کی مہکار کے
بھینی رُت میں ڈُوب کے بُھولی مَیں سب دکھ سنسار کے

کیسَریا چُنری رنگوائی، انگ بھگوئے لال میں
لال گلاب پیا کے من کو بھا جاوے ہر حال میں

شیتل جل دو گھونٹ پِلا دے، برکھا ! تیری خیر ہو
پلکیں موند کے نیند کروں تو پیا نگر کی سیر ہو

ایک شعر

تنہائیِ شب میں ترے ہونے کی تمنّا
روتے ہوئے بچّے کو کھلونے کی تمنّا

تحفے

اگر تُو کہے تو
مَیں شاخِ شبِ قدر سے توڑ لاؤں
چمکتے دمکتے ستاروں کے گچھے
اُنہیں اِک سنہری سبک طشتری میں رکھوں
اور تجھے پیش کر دوں
کہ لے، میرے عشقِ زبُوں پر یقیں کر

اگر تُو کہے تو
چہکتے بہشتی پرندوں پہ چپکے سے اِک جال پھینکوں
اُنہیں پھڑ پھڑاتے ہوئے ہی گرفتار کر لوں
غباروں کے مانند دھاگوں سے باندھوں
تجھے پیش کر دوں
کہ لے، میرے جذبِ دِرُوں پر یقیں کر

اگر تُو کہے تو

بخارا، سمرقند، تہران، بغداد، لاہور اور قرطبہ کی فضاؤں سے

خوشبو چُراؤں

اُسے اپنی آنکھوں میں بھر کے

تجھے پیش کر دوں

کہ لے، چاہتوں کے فسوں پر یقیں کر

اگر تُو کہے تو

شفق رنگ بارش کے قطروں سے مالا بناؤں

خموشی کے ساتوں سُروں سے کوئی گیت بالکل نرالا بناؤں

محبت کے اظہار کا اک انوکھا حوالہ بناؤں

ترے نام کا پھول کوئی سدا رہنے والا بناؤں

اُسے اپنی ویراں ہتھیلی پہ رکھ کے

تجھے پیش کر دوں

کہ لے، اب تو میرے جنوں پر یقیں کر

اگر پھر بھی شک ہے

ہری موت تک ہے
تو کیا اپنا مجنون سر کاٹ کر
تیرے قدموں میں دھر دوں؟
کہ لے اور مجھے دفن کرنے سے پہلے
مرے گرم اور سرخ خوں پر یقیں کر
مری چاہتوں کے فسوں پر یقیں کر
مری دھڑکنوں کے جنوں پر یقیں کر
مرے دل کے عشقِ زبوں پر یقیں کر
اگر تُو کہے تو

مقطعِ سلسلۂ شوق

O

نشے میں ڈوب گیا مَیں، فضا ہی ایسی تھی
دیارِ حُسن کی آب و ہوا ہی ایسی تھی

نہال کر دیا پلکوں کی اوٹ سے مجھ کو
نگاہِ یار! تری کم نگاہی ایسی تھی

ہماری پوری گواہی بھی معتبر نہ رہی
کسی حسین کی آدھی گواہی ایسی تھی

بدن کی شاخ پہ ایک آدھ پھول بھی نہ رہا
ہوائے موسمِ ہجراں بلا ہی ایسی تھی

اٹھی نہیں مری آنکھیں مگر جھکی بھی نہیں
برہنگی کے بدن پر قبا ہی ایسی تھی

مرے ہی اِذن سے چلتی تھیں دھڑکنیں اُس کی
کسی کے دِل پہ مری بادشاہی ایسی تھی

مرا گناہ نہیں ڈگمگانا ایماں کا
خدا گواہ وہ کافر ادا ہی ایسی تھی

محل میں جھوم اٹھیں شاہزادیاں ساری
گدا ہی ایسا تھا اور التجا ہی ایسی تھی

بُرا سلوک سہا اور ترا بھلا چاہا
ہمارے دل میں تری خیر خواہی ایسی تھی

فُرات و نیل کے پانی سے بھی نہ دُھل پائی
منافقوں کے دِلوں پر سیاہی ایسی تھی

ہر اِک مکان کا دروازہ کھل گیا فارس
گلی میں گونجنے والی صدا ہی ایسی تھی

○

خواب کدھر چلا گیا؟ یاد کہاں سما گئی؟
چشم و چراغِ عشق کو کون ہوا بجھا گئی؟

ہجر تو جاگتا رہا روح کے دردزار میں
جسم کی خواب گاہ میں وصل کو نیند آ گئی

وقت نے ختم کر دیے سارے وسیلے شوق کے
دل تھا اُلٹ پلٹ گیا، آنکھ تھی بجھ بجھا گئی

نرم لبوں سے سخت بات ایسے ادا ہوئی کہ بس
شہد میں مل گیا نمک، دن میں ہی رات چھا گئی

رنگ برنگ تتلیو! اب کسے ڈھونڈتی ہو تم ؟
خوشبو کو لے گئی ہوا، پھول کو خاک کھا گئی

ہم تو بس اچھے دوست تھے، ہم تو بس اچھے دوست ہیں
پھر یہ ہمارے درمیان پریت کہاں سے آ گئی ؟

ایک تمہارے دل میں تھا، ایک تھا میری آنکھ میں
آندھی چلی فراق کی، دونوں گھروندے ڈھا گئی

جسم تو خیر جسم تھا، جسم کا تذکرہ ہی کیا
ایک نگاہ میں وہ آنکھ روح کے بھید پا گئی

بُھولی ہوئی صدا کا چاند صحن میں چمکا؟ یا بجھا؟
گزرے ہوئے دنوں کی یاد دھیان میں آئی یا گئی؟

صبر کی رہگزار پر ایسے مِلی شبِ طلب
مجھ کو بھی ڈگمگا دیا، آپ بھی لڑکھڑا گئی

چشم زدن میں دو جہاں جیسے اُلٹ کے رہ گئے
آنکھ جھکی تو حشر اُٹھا، آنکھ اُٹھی تو چھا گئی

○

کسی بھی طور بہلتا نہیں جنوں تیرا
مرے تڑپتے ہوئے دِل! مَیں کیا کروں تیرا؟

بھُلا دِیا مجھے تُو نے اگرچہ دم بھر میں
دُعا ہے آخری دم تک مَیں دم بھروں تیرا

طلسمِ ہوش رُبا سے بھی کچھ زیادہ تیز
جمالِ یار ! بہت تیز ہے فسوں تیرا

تُو میرے واسطے ممنوع پھل سہی لیکن
مجھے یہ دُھن ہے کہ مَیں ذائقہ چکھوں تیرا

دیارِ یار کی گلیوں میں جا کے رو فارس
وہیں قرار ہے تیرا، وہیں سکوں تیرا

○

اب بھی ہے یاد مجھ کو پہلی لگن کا جادُو
سر چڑھ کے بولتا تھا اُس کے بدن کا جادُو

قامت تھی یا قیامت، شعلہ تھا یا سراپا
پھیکا تھا اُس کے آگے سرو و سمن کا جادُو

آنکھوں میں تیرتے تھے ڈورے سے رتجگوں کے
انگڑائی میں گھلا تھا میٹھی تھکن کا جادُو

کلیوں کے جیسے کومل تھے ہاتھ پاؤں اُس کے
غُنچوں کو چھیڑتا تھا اُس کے دہن کا جادُو

وہ سر سے پاؤں تک تھا مرمر کا بُت مکمل
بڑھتا تھا اُس کو چُھو کر ہر پیرہن کا جادُو

کاجل بِنا تھیں آنکھیں، لالی بغیر لب تھے
یہ سادگی کا افسوں، وہ بھولپن کا جادو

پہلے رہا تھا کچھ دِن انکار اُن لبوں پر
پھر چل گیا تھا میرے دیوانہ پن کا جادُو

گر سچ کہوں تو فارس وہ شخص عام سا تھا
چمکا گیا تھا اُس کو میرے سخن کا جادو

O

چمکتے اشکوں کی تسبیح لے کے ہاتھوں میں
مَیں تجھ کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں طاق راتوں میں

وہ ہنس رہا تھا مگر سن کے رو پڑا مَیں تو
بڑی شدید اداسی تھی اُس کی باتوں میں

کچھ اِس لیے بھی ہے میری غزل میں سرخی سی
مَیں بھرتا رہتا ہوں اپنا لہو دواتوں میں

چلو یہ مانا تری جیت ہے عظیم مگر
ہماری مات بھی ہے یادگار ماتوں میں

پُکارتی ہیں مجھے وہ صدائیں بھی فارس
چُھپی ہوئی ہیں جو نادیدہ کائناتوں میں

O

قطرہ قطرہ ہمیں ترسائے نہ کم کم برسے
اُس نے گر ہم پہ برسنا ہے چھما چھم برسے

تُو نے جھیلی ہے کبھی ایسی اذیت جس میں
لبِ خاموش ہنسے، دیدۂ پُرنم برسے؟

O

معاملہ تبھی چلتا اگر ہوا چلتی
مَیں عِطر والا تھا، میری دکان کیا چلتی

○

غضب کی دُھن، بلا کی شاعری ہے
خموشی انتہا کی شاعری ہے

بجز سجدہ نہیں ہے داد ممکن
ترا چہرہ خدا کی شاعری ہے

اِسے اب پھیلنے سے کون روکے
یہ خوشبو تو ہوا کی شاعری ہے

بلک اُٹھے ہیں سارے سننے والے
یہ کس درد آشنا کی شاعری ہے

○

کھیل آسان تو نہیں، مرے دوست!
تُو پریشان تو نہیں، مرے دوست؟

کس لیے تُم جتاتے رہتے ہو؟
عشق احسان تو نہیں، مرے دوست!

زخم کھا کر بھی چپ رہے کب تک؟
سنگ انسان تو نہیں، مرے دوست!

دوستی میں بھی تیرے مدِّنظر
نفع نقصان تو نہیں، مرے دوست؟

بن کے فارس جو کھو گیا تھا کہیں
تُو وہ رحمان تو نہیں، مرے دوست؟

○

ذرا سا دھیان کیا، دھیان کر کے لوٹ گیا
وہ میرے ضبط کا نقصان کر کے لوٹ گیا

مَیں ایک باغ تھا ان دیکھی خوشبوؤں والا
وہ آیا اور مجھے ویران کر کے لوٹ گیا

رواروی میں کوئی نام لے لیا اُس نے
ہنسی ہنسی میں پریشان کر کے لوٹ گیا

مَیں کیا بتاؤں کہ پھر بستیوں پہ کیا گذری
وہ شہ سوار تو اعلان کر کے لوٹ گیا

عجب خوشی ہے، ندامت بھی لائی ہے، فارس
عجیب غم تھا جو حیران کر کے لوٹ گیا

○

تجھے بھی اشتیاقِ دیدۂ نم ہے تو آ جا
بپا ہے محفلِ گریہ، اگر دم ہے تو آ جا

رضا کارانہ سہتا ہُوں مَیں غُصّہ دِل جلوں کا
ترا دِل بھی کسی پیارے پہ برہم ہے تو آ جا

گروہِ عاشقاں کی رُکنیت مُشکل نہیں ہے
ترا سب کچھ فدائے حُسنِ جانم ہے تو آ جا

عطا ہوتا ہے رزقِ غم، پھر آتی ہے یہ آواز
زیادہ ہے تو فارس عیش کر، کم ہے تو آ جا

لڑاکا لوگوں کے نام

چھوٹے بچوں کی طرح پل میں بگڑ بیٹھتے ہیں
عشق اتنا ہے کہ ہم روز جھگڑ بیٹھتے ہیں

دو گھڑی صلح صفائی، کئی دن دنگا فساد
کیسے معصوم ہیں، ہنستے ہوئے لڑ بیٹھتے ہیں

لاکھ ہم روٹھیں مگر آپ منا لیں گے ہمیں
بس اِسی مان پہ ہم آپ سے اڑ بیٹھتے ہیں

O

تمہارا نقشِ قدم ہے ہماری جائے نماز
کہیں بھی اور نہ جائیں گے ہم برائے نماز

شروعِ عشق میں سجدوں کا مت تقاضا کر
خدا کو مان ، ابھی تو ہے ابتدائے نماز

امام چاہیئے ہم بے نمازیوں کو بڑا
پڑھیں گے ہم بھی اگر خود خُدا پڑھائے نماز

ایک شعر

گیا ہے جو بھکاری، جانتے ہو کون تھا یہ؟
خود اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعون تھا یہ

○

یار ! تُو میرے درد کو میری سخن وری نہ جان
چیخ کو شعر مت سمجھ، آہ کو شاعری نہ جان

سطح پہ تو سکون ہے، تہہ میں بڑا جنون ہے
جھیل کی خامشی کو تُو جھیل کی خامشی نہ جان

تُو میرا پہلا عشق تھا، تُو میرا پہلا عشق ہے
بات تو ٹھیک ہے مگر پہلے کو آخری نہ جان

شوق ہو چاہے دید ہو، جو بھی ہو بس شدید ہو
دیکھ تو سرسری نہ دیکھ، جان تو سرسری نہ جان

اتنا نہ خود فریب بن، ایسے نہ خود سے جھوٹ بول
عشقِ زیاں نصیب کو حاصلِ زندگی نہ جان

جسم کے آر پار دیکھ، روح کا شاہکار دیکھ
عام سے آدمی کو بھی عام سا آدمی نہ جان

بے خَبَری کی رکھ خبر، کم نَظَری پہ کر نظر
اِس بتِ بے نیاز کے ظلم کو دائمی نہ جان

یار ہے کوئی اور شے، سو مرے فارسا! اُسے
چاند نہ کہہ، صبا نہ بول، پھول نہ لکھ، پری نہ جان

○

مَیں کہتا ہُوں اُسے مت دیکھو لیکن
مری آنکھیں مری سُنتی کہاں ہیں

○

کوئی بھیک رُوپ سرُوپ کی، کوئی صدقہ حسن و جمال کا
شب و روز پھرتا ہُوں در بدر مَیں فقیر شہرِ وصال کا

کسے فکر بُود نبُود کی، کسے ہوش ہے مہ و سال کا
مری آنکھ میں ہے بسا ہوا کوئی معجزہ خدو خال کا

بڑی شستگی سے نبھا گیا سبھی چشم و لب کے مُعاملے
سو کھُلا کہ صرف حسیں نہ تھا، وہ ذہین بھی تھا کمال کا

یہاں دوستوں کا ہجوم ہے، مجھے اس سے کیا، مجھے اس سے کیا
مجھے علم ہے کہ ترے سوا کوئی حال نئیں مرے حال کا

مرے حرف دشتِ خیال میں کہیں چَین لیتے نہ تھے مگر
وہاں آ کے رام ہوئی غزل جہاں رم تھا میرے غزال کا

O

اِسی میں چُھپ کے بلکنا، اِسی پہ سونا ہے
تمہارا غم ہی مرا اوڑھنا بچھونا ہے

بس ایک پھول سے لمحے کی آرزو میں ہمیں
تمام عمر محبت کا بوجھ ڈھونا ہے

مری یہ دُھن ہے بطورِ نگاہِ دارِ جمال
کہ تجھ کو آنکھ میں، پھر شعر میں سمونا ہے

جو میرا ہو وہ کسی اور کا نہیں رہتا
بس اتنا جان لے جس کو بھی میرا ہونا ہے

جھٹک تو دوں مَیں اُسے خواب گاہ سے باہر
مگر یہ چاند مری نیند کا کھلونا ہے

ہنسی ہنسی میں تجھے الوداع کہہ کے ہمیں
تمام عمر کہیں چُھپ کے رونا دھونا ہے

ہوائے شام اگر سازگار ہو تو مجھے
کسی کے دل میں محبت کا بیج بونا ہے

تمہارے میرے علاوہ ہے تیسرا بھی کوئی
تمہارا میرا تعلق عجب تکونا ہے

ہنوز پہنچا نہیں ہوں مَیں اُس بلندی تک
جہاں سے گر کے مجھے پاش پاش ہونا ہے

ابھی سے تان لیں یاروں نے چھتریاں فارس
ابھی تو درد کی رِم جھم نے من بھگونا ہے

پارۂ سنگ

عورت

بینائی کے طلسم سے آگے بھی دیکھیے
منظر کو ایک قسم سے آگے بھی دیکھیے

کچھ اور بھی ہیں راز خدوخال سے پرے
عورت کو اس کے جسم سے آگے بھی دیکھیے

تُم

تُم مِری آگ ہو
جس کو پل پل مَیں رکھتا ہوں روشن
محبت کی مشعل سے
اور اپنی سانسوں کے ایندھن سے
اور اس کے شعلوں سے کلیاں بناتا ہوں
سرخ اور سبز اور جادو بھری
جن کی چنگاریوں سے جُڑی ہیں مری دھڑکنیں
جانِ جاں! تُم مِری آگ ہو

تُم مِری جھیل ہو
جس کے نیلے کناروں کی حد سے پرے
روز اُڑ کے پہنچتا ہوں

گُم صُم پرندوں کے مانند

اور گھٹنوں پاؤں ڈبوئے تمہارے ہرے پانیوں میں

مَیں شاداب رہتا ہوں

سیراب رہتا ہوں

اے جانِ جاں! تُم مِری جھیل ہو

تُم مِری خاک ہو

جس سے گوندھا گیا

میرے تن من کو

اور پھر بنائے گئے میرے سب خال وخد

میرا ہونا تمہاری عطا ہے

اگر تُم نہ ہوتی

تو بے شکل ہوتا مَیں، بے نام ہوتا

مِری جانِ جاں!

تُم مِری خاک ہو

تُم مہکتی لہکتی ہوا ہو مِری

جس کی انگلی پکڑ کر مَیں بے نام باغوں میں پھرتا ہوں
اور لوٹتا ہی نہیں
جس کی خوشبو سے پُر ہیں مِری سانس کے سب دیے
میرا ہر سانس تحفہ تمہارے لیے
کفر کی تہمتوں کو ذرا بھول کر
کیوں نہ کہہ دوں کہ ہاں تُم خدا ہو مِری
تُم مہکتی لہکتی ہوا ہو مِری

عرضی

نہیں پڑتے حسابِ بیش و کم میں
ہم اہلِ عشق ہیں اہلِ قناعت
بہت چھوٹی سی اپنی آرزو ہے
بہت ہی مختصر ہے اپنی چاہت
ترے اِکرام کا ایک آدھ لمحہ
ترے اِقرار کی ایک آدھ ساعت
کبھی دِیدار کے دو چار سِکّے
کبھی خیرات میں تھوڑی محبت
سحر کے وقت اِنعامِ تبسم
تو شب کو بوسۂ لب کی اجازت

ہمیں لالچ نہ پہلے تھا نہ اب ہے
مگر تجھ سے فقط اِتنی طلب ہے
''خُدارا سُوئے مُشتاقاں نگاہے
پیاپے گر نہ باشُد، گاہے گاہے''

شامی بچوں کا نوحہ

بچہ ہے ، اِس کو یوں نہ اکیلے کفن میں ڈال
ایک آدھ گڑیا ، چند کھلونے کفن میں ڈال

نازک ہے کونپلوں کی طرح میرا شیر خوار
سردی بڑی شدید ہے ، دُہرے کفن میں ڈال

کپڑے اِسے پسند نہیں ہیں کُھلے کُھلے
چھوٹی سی لاش ہے، اِسے چھوٹے کفن میں ڈال

دفنا اِسے حُسَینؑ کے غم میں لپیٹ کر
یہ کربلائی ہے ، اِسے کالے کفن میں ڈال

ننھا سا ہے یہ پاؤں ، وہ چھوٹا سا ہاتھ ہے
میرے جگر کے ٹکڑوں کے ٹکڑے کفن میں ڈال

مجھ کو بھی گاڑ دے مرے لختِ جگر کے ساتھ
سینے پہ میرے رکھ اِسے، میرے کفن میں ڈال

ڈرتا بہت ہے کیڑے مکوڑوں سے اِس کا دِل
کاغذ پہ لکھ یہ بات اور اِس کے کفن میں ڈال

عیسیٰ کی طرح آج کوئی معجزہ دِکھا
یہ پھر سے جی اُٹھے، اِسے ایسے کفن میں ڈال

سوتا نہیں ہے یہ مری آغوش کے بغیر
فارس! مجھے بھی کاٹ کے اِس کے کفن میں ڈال

وہ بھولا بسرا نام

کچھ ایسے جھوم کے آنکھوں میں جھلملائی ہے شام
کہ دھیان میں چمک اُٹھا ہے مثلِ ماہِ تمام

وہ بھولا بسرا نام

وہ نام جس سے بج اُٹھتی تھیں گھنٹیاں دل میں
بلند ہوتی تھی پھر عشق کی اذاں دل میں

اذاں ۔ جنوں کا پیام

وہ نام جس کے ادب سے نگاہ جھکتی تھی
وہ نام جس کی تلاوت کبھی نہ رُکتی تھی

سجود ہوں کہ قیام

وہ نام آتا زباں پر تو دل دھڑکتا تھا
پھر اُس کے بعد کوئی بھی نہ کھینچ سکتا تھا

بہکتے دل کی لگام

وہ نام ہم جسے دن رات گنگناتے تھے

وہ جس کے حرف ہمیں روز و شب پلاتے تھے

سرورِ عشق کے جام

مگر یہ بات ہمیں وقت نے سکھائی ہے

کہ ہر ملن کا مقدر فقط جدائی ہے

نہیں کسی کو دوام

سو ہم بھی آخر اُسی اختتام کو پہنچے

وہ اب جہاں بھی ہے، اُس نیک نام کو پہنچے

ہمارے دل کا سلام

مکالمہ

سو مَیں نے کہا اُس پری زاد سے
کہ سُن تو سہی میری آنکھوں کی چاپ
مرے دِل کے ہونٹوں پہ ہے دم بہ دم
ترے حُسن کی راگنی کا الاپ
تجھے بھی تو رکھتی ہے دِن رات مست
تری دھڑکنوں کی جنوں خیز تھاپ
تو سچ سچ بتا کیا یہ ممکن نہیں؟
کہ ہو جائے دونوں دلوں کا ملاپ
پگھل جائے گی سردمہری کی برف
مرے پاس آ ، وصل کی آگ تاپ

سمجھ تو گئی تھی وہ جانِ حیا
سو اِقرار کی تھی نگاہوں پہ چھاپ
مگر کم سخن تھی سو کہنے لگی
کہ رحمان فارس ! بڑے وہ ہیں آپ

ایک الزام کے جواب میں کہی گئی نظم

سنو، میری جاں!

تُم سدا ایک رم خوردہ، وحشت زدہ اور سراسیمہ ہرنی کے مانند

ڈرتی ہو مجھ سے

بدکتی ہو مجھ سے

سنو، میری جاں! اور دیکھو

مرے ہاتھ میں کوئی دودھاری خنجر نہیں، میرا دل ہے

مرے پاس ترکش نہیں ہے، غزل ہے

خدا کی قسم، میرے رختِ سفر میں

کتابوں، گلابوں اور ایک آدھ جام و سبو کے سوا

اور کچھ بھی نہیں ہے

تمہاری جواں خوشبوؤں کے تعاقب میں

دشتِ جنوں چھان مارا ہے مَیں نے
تمہارے ہی نقشِ کفِ پا کے پیچھے مَیں صحرائے پر ہَول طے کر چکا ہوں
یہ کاہش ہوس کی نہیں، عشق کی ہے

سنو، مَیں محبت کے معصوم جذبے سے عاری نہیں ہوں
نہیں، میری جاں! میں شکاری نہیں ہوں

عام سا اِک دِن

عام سا اِک دِن، طلوعِ مہر بھی معمول کا
رہگزارِ وقت پر لمحوں کی بگھی گامزن
اور بگھی کے تعاقب میں بگولا دھول کا
شہر کی گلیوں میں لمبی سانسیں لیتی زندگی
اِس طرف طفلانِ بے پروا کے کمسن قہقہے
اُس طرف محوِ تلاشِ رِزق لوگوں کا ہجوم

دل۔ دھڑکتے دِل۔ بہت سی خواہشیں پالے ہوئے
آنکھیں۔ پُر امید آنکھیں۔ خوابِ فردا سے سجی
پاؤں۔ ان دیکھے دیاروں کی طرف ہر پل رواں

یک بیک پُر ہول ہلچل، اِک دھما کا دلخراش
چاروں جانب خون، معصوموں کے تن کے لوتھڑے
موت خود ششدر، فلک حیران، عزرائیل گنگ

کانپتے ہاتھوں سے ٹیلی فون کرتی انگلیاں
سُرخ اندیشوں کی آندھی، جان و دِل کے خار وخس
اِک خبر۔ گالوں پہ بہتے گرم آنسو۔ اور بس

عزم

اُس کے کوچے سے جب بھی لوٹتا ہوں
بعد از صد خرابیٔ بسیار
خاک برسر ، برہنہ پا اور خوار
آ کے کہتا ہوں اپنے یاروں سے
اب اُدھر کا کبھی مَیں رُخ بھی کروں
تو مرا نام تُم بدل دینا
اور پھر اگلے روز ہی فارس
جا کے کہتا ہوں اپنے یاروں سے
کوئی اچھا سا نام بتلاؤ
یُوں بھی فارس مجھے پسند نہیں

ڈھول کی تھاپ پر کہی گئی ایک نظم

سُن اے ان دیکھی سانولی! تری آس مجھے ترسائے
مری روح کے سُونے صحن میں ترا سایہ سا لہرائے

ترے ہونٹ سُریلی بانسری، ترے نیناں مست غزال
تری سانسوں کی مہکار سے مرا حال ہوا بے حال

کچھ دھوپ ہے اور کچھ چھاؤں ہے ترا گھٹتا بڑھتا پیار
انکار میں کچھ اقرار ہے، اقرار میں کچھ انکار

مجھے بستی بستی لے پھرا تری سُندرتا کا عشق
مکّہ، یثرب اور قونیہ، دِلّی، ملتان، دمشق

مَیں سُدھ بُدھ کھو کر پی گیا من مستی والا جام
اب دُکھ میرا سُکھ چین ہے اور درد مرا آرام

بیادِ شہدائے پشاور

(آرمی پبلک سکول کے شہید بچوں کا نوحہ)

تسلیم ہے کہ موت سے ممکن نہیں فرار
مانا کہ زندگی نہیں بالکل وفا شعار
ہر منبعِ حیات پہ ہوگا اجل کا وار
خوشبو ہے دیرپا نہ کوئی پھول پائیدار
لیکن یہ رنگ تو ابھی کچّے تھے، ہائے ہائے
کم سِن تھے، بے گناہ تھے، بچّے تھے، ہائے ہائے

تھے چودھویں کے چاند وہ معصوم نَونہال
عُمریں قلیل، ننھے بدن، بھولے خدّ وخال
بے فکریوں کا دَور تھا، بچپن کے ماہ و سال
وا حسرتا کہ ہو گئے اپنے لہو میں لال
گُل پیرہن تھے اور کفن پوش ہو گئے
گودی سے اُترے، قبر میں رُوپوش ہو گئے

ہر گُل عذار کتنے دِلوں کا سُرور تھا
نخلِ اُمید کا بڑا خوش رنگ بُور تھا
ہر چاند والدین کی آنکھوں کا نُور تھا
بھائی کا زورِ بازو، بہن کا غرور تھا

سَو منّتوں، ہزار مُرادوں کے پھل تھے وہ
نعم البدل مِلے گا کہاں؟ بے بدَل تھے وہ

کِس مان سے سنوارا تھا ماؤں نے صبح دم
کِس بھولپن سے جانبِ مقتل اُٹھے قدم
تھامے قلم کتاب تو سر ہو گئے قلم
جِس دم اُٹھا کے لائے گئے، جان تھی نہ دم

کیا خوب درس گاہ تھی کیا امتحاں لیا
غم کا سبق پڑھائے بِنا اِمتحاں لیا

اَب داستانِ رنج و الم کیا کروں بیاں؟
وقتِ وداع، نزع کا عالم، وہ ہچکیاں
ننّھے لبوں پہ تازہ لہو کی وہ پپڑیاں
وہ شکوہ سنج آنکھیں، وہ خاموش سسکیاں

ماں باپ کو پُکارا تو ہوگا کہ آیئے
اپنے جگر کے ٹکڑوں کے ٹکڑے اُٹھایئے

دَوڑے تو ہوں گے ، ہائے ، وہ بچّے اِدھر اُدھر
دیکھا تو ہو گا سُوئے فلک بھی بچشمِ تر
چیخوں سے اُن کی کانپ اُٹھے ہوں گے بام و در
لیکن کہیں سے آئی نہ امداد وقت پر

بھائی بہن کا نام لیا اور مر گئے
ماں باپ کو سلام کیا اور مر گئے

ناحق بہے جو خُون تو کانپ اُٹھتا ہے فلک
بے چارگاں کی آہ تو جاتی ہے عرش تک
ظالم کی موت ہے دلِ مظلوم کی کسک
اِن قاتلوں کے باب میں رکھیو نہ کوئی شک

جِس میں انہیں جلانا خُدا کا اصول ہے
اُس آگ آگے نارِ جہنم بھی پھول ہے

اِن ظالموں کا ظُلم تو خود ظُلم کو رُلائے
لعنت خود اِن کے لعنتی چہروں سے مُنہ چُھپائے
نفرت بھی اِن کو دیکھے تو نفرت سے تھوک جائے
گالی انہیں مِلے بھی تو گالی کو شرم آئے

شیطاں بھی اِن کے باطنِ بد کو سزائیں دیں
خود بددعائیں اِن کو سدا بددعائیں دیں

بے چارگاں کے آخری دیدار کی قسم
صبرِ حسینؑ و حیدرِؓ کرّار کی قسم
دشمن کو ڈھونڈتی ہوئی تلوار کی قسم
فارس ! ہمارے لشکرِ جرّار کی قسم

سوئیں گے چین سے نہ کبھی سوگوار اب
ماریں گے ایک ایک کے بدلے ہزار اب

بدلے کی آگ اپنی جگہ ہے مگر یہ غم
ہم سَو برس بھی جی لیں تو ہو پائے گا نہ کم
ہر روز یاد آئے گا یہ ظلم، یہ ستم
تا عُمر جانے والوں کو رویا کریں گے ہم

آنکھوں سے وہ جُدا سہی، دل سے پرے نہیں
ہاں، ہم ہیں کم نظر، شُہَدا تو مَرے نہیں

اے کربلائے نَو! ترے قُربان، صبر کر
تجھ پر فدا ہیں میرے دل و جان، صبر کر
رو رو کے ہو نہ جائے تُو ہلکان، صبر کر
میرے پشاورا ! مرے بے جان! صبر کر

ماتم ہے، غم ہے، سوگ ہے، آنسو ہیں، بَین ہے
شہرِ پشاور آج سے شہرِ حُسینؑ ہے

ملالہ یُوسف زئی

ایک اُمید پسِ دیدۂ تر زندہ ہے
فاختہ خُون میں لت پت ہے مگر زندہ ہے

ورنہ گُل چیں سبھی کلیوں کو مسل ڈالے گا
غیرتِ اہلِ چمن! جاگ اگر زندہ ہے

ریزہ ریزہ ہیں مرے آئنہ خانے لیکن
مطمئن ہُوں کہ مرا دستِ ہنر زندہ ہے

سانحہ یہ ہے مرا رختِ سفر لُوٹا گیا
معجزہ یہ ہے مرا شوقِ سفر زندہ ہے

کٹ گِریں ایک دو شاخیں تو کوئی فکر نہیں
پھر نمُو پائے گا اِک روز، شجر زندہ ہے

آشیاں پھونک دِیا بُغض کے شعلوں نے مگر
راکھ میں اب بھی محبت کا شرر زندہ ہے

فروغ فرخ زاد

فروغ!
وہ تجھ سے ڈر گئے تھے
فروغ!
تُو سر بسر جنوں تھی
سو عقل و دانش کے دیوتا تجھ سے ڈر گئے تھے
اندھیر نگری کے حکمرانوں کو
تیری آنکھوں کی روشنی میں
دکھائی دیتی تھی موت اپنی
ازل کے اندھوں کو
تیرے ماتھے کے چاند سے خوف آ رہا تھا
ترے سخن میں وہ آگ روشن تھی
جس کے سرخ و سپید شعلے تمام ایران میں عیاں تھے

ہر ایک آتش کدے کی جاں تھے

تری صدا سے جہانِ مکر و ریا کے سلطاں لرز گئے تھے

فروغ!

وہ تجھ سے ڈر گئے تھے

فروغ!

دُنیا فریب خانہ ہے آب و گِل کا

سو تیرے دل کا جمال...... سچا جمال...... کیسے نہ قتل ہوتا

تُو زندہ رہتی

تو سارے خود ساختہ خداؤں کو مار دیتی

سیاہ باطن منافقوں کے چمکتے چہرے اُتار دیتی

سو حاسدوں کے دماغ اندیشہ ہائے فردا سے بھر گئے تھے

فروغ! وہ تجھ سے ڈر گئے تھے

مجھے تمغۂ حُسنِ دیوانگی دو

مجھے تمغۂ حُسنِ دیوانگی دو
کہ مَیں نے سہی ہے
دل و جاں پہ دونوں جہانوں کی وحشت
نفس در نفس در نفس وہ اذیّت
کہ جس سے اُبل آئیں یزداں کی آنکھیں
اذیّت کہ جس سے
مرے روز و شب سے نچڑنے لگا ہے شفق رنگ لاوا
شفق رنگ لاوا جو میرا لہو ہے
لہو جو رگ و پے میں چیخوں کے مانند ہے محوِ گردش
وہی تیز گردش
جو دل کی پراسرار محراب میں گونجتی ہے دمادم
شدید اور پیہم
مجھے تمغۂ حُسنِ دیوانگی دو

مجھے تمغۂ حُسنِ آوارگی دو

کہ جاں ہار کر چھان مارے ہیں مَیں نے

شمالی جہانوں کے سارے سمندر

جنوبی زمانوں کے سارے ستارے

ازل تا ابد کے شفق تاب باغوں کے سارے کنارے

کنارے کہ جن کی حدیں ہیں پرندِ تخیل کی ہر ہر رسائی سے آگے

خداؤں کی ساری خدائی سے آگے

ہر اِک در پہ پہنچی مرے دل کی ٹِک ٹِک

نہیں چھوڑا کچھ بھی نہ مغرب نہ مشرق

مجھے تمغۂ حُسنِ دیوانگی دو

مجھے تمغۂ حُسنِ بیگانگی دو

کہ اِک ثانیے میں مِٹا ڈالے مَیں نے

وہ سب نقشِ صد رنگ جو رُوح کے حافظے پر کُھدے تھے

وہی حافظہ جو تمہارے خد و خال سے تھا مزیّن

بس ایک ثانیے میں بھلا ڈالے مَیں نے

شب و روز سارے

مجھے تمغۂ حُسنِ بیگانگی دو

مگر اے سخی! جتنے تمغے بھی دو گے
اگر چاہتے ہو تو لے لینا مجھ سے
اور ان سب گراں مایہ تمغوں کے بدلے
فقط یہ صلہ ہو
تمہارے شفق رنگ پیروں کا ایک ایک بوسہ عطا ہو

ہم اہلِ عشق ہیں، صدیوں کو چمکاتے رہیں گے

ہم اہلِ عشق ہیں، صدیوں کو چمکاتے رہیں گے
ہم آتے ہی رہے ہیں اور ہم آتے رہیں گے

یہ آنسو: ان گنت قرنوں کے ماتھے کا پسینہ
یہ وحشت: بے شمار ادوار کے غم کا خزینہ
یہ لا محدود اذیّت، یہ زمانوں کے کچوکے
مگر ہم عشق والے ہیں، خدا بھی کیسے روکے؟

خدا سے لڑ جھگڑ کے بھی اُسے بھاتے رہیں گے
ہم آتے ہی رہے ہیں اور ہم آتے رہیں گے

خدائی بھی ہماری ہے، خدا بھی ہے ہمارا
فرازِ عرش کا تارہ ہمارا استعارہ
مُحیطِ مشرقین و مغربین اپنا ہی گھر ہے
حیات و موت سے بھی ماورا اپنا سفر ہے

سفر میں بھی اِسی مصرعے کو دہراتے رہیں گے
ہم آتے ہی رہے ہیں اور ہم آتے رہیں گے

ہماری سانس سلجھن کائناتی الجھنوں کی
صدائے کُن امانت ہے ہماری دھڑکنوں کی
ہماری آنکھ کے اندر ہے سیّاروں کا میلہ
ہماری سرکشی کا ڈر دلِ یزداں نے جھیلا

دلِ یزداں کو اِن کھیلوں سے بہلاتے رہیں گے
ہم آتے ہی رہے ہیں اور ہم آتے رہیں گے

بابِ گریہ

○

فنا کی رہگزر پہ منزلِ بقا حُسَینؑ ہے
یہی ہے قصہ مختصر ، یزید تھا حُسَینؑ ہے

دُکھوں نے پوچھا کون ہے خدائے کائناتِ غم ؟
ٹپکتے آنسوؤں نے چیخ کر کہا : حُسَینؑ ہے

کرو گے کتنے قتل اِن نشانیوں کو دیکھ کر ؟
کہ آنکھ نم ہے اور زباں پہ وردِ یا حُسَینؑ ہے

زمانے بھر کے سب غموں کا غمگسار ہے یہ غم
سو درد چاہے جس طرح کا ہو ، دوا حُسَینؑ ہے

تُو مسلکوں کو چھوڑ اور گلے سے لگ یہ سوچ کر
کہ جو ترا حُسَینؑ ہے وہی مِرا حُسَینؑ ہے

سوالِ بیعتِ یزید پر جہاں بھی سر جھکیں
وہاں نہیں نہیں کی گونجتی صدا حُسَینؑ ہے

بس اتنا یاد رہ گیا دُکھوں کی داستان میں
کہ ابتدا حُسَینؑ تھا اور انتہا حُسَینؑ ہے

بچا لیا برہنگی سے جس نے دین کا بدن
وہی کٹی پھٹی لہو بھری قبا حُسَینؑ ہے

ہزاروں سال بعد بھی وہی الم ، وہی کسک
قدیم ہو کے بھی بہت نیا نیا حُسَینؑ ہے

شہزادہ علی اصغرؑ

کیا بتاؤں کہ اصغرؑ پہ لکھتے ہوئے وقت کیسا کٹا
کیوں نظر خوں ہوئی ، کیا رگیں چر گئیں ، کب کلیجہ کٹا

سوچیے کتنا مُنّا سا ہوتا ہے چھ ماہ کا شیر خوار
ایک ہی تیر سے چہرہ چھلنی ہوا اور سینہ کٹا

کوفیوں سے کہو بی بی زینب کے دِل سے کبھی پوچھ لیں
کیسے لختِ جگر کے بِنا عُمر کا لمحہ لمحہ کٹا

عرش پر خود خدائے محمدؐ کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں
شاہ کی گود میں جب بلکتا ہوا شاہزادہ کٹا

جیسے قرآن کی سب سے چھوٹی صدا یعنی کوثر تھی
اور غلافِ حرم پاک کا ایک ننھا سا ٹکڑا کٹا

حُرملہ ! تیرے حملے سے پہلے وہ گُل پیاس کے تیر سے
لحظہ لحظہ چھِلا ، ہولے ہولے چھِدا ، تھوڑا تھوڑا کٹا

اُن بہتّر میں فارس اکہتر کا غم تو ہے اپنی جگہ
لیکن اُس شام کٹ جانے والوں میں جوسب سے چھوٹا کٹا

○

تُم ہو معراجِ وفا، اے کشتگانِ کربلا !
ورنہ آساں تو نہیں تھا امتحانِ کربلا

ہر کہانی جس نے لکّھی ہے ازل سے آج تک
وہ بھی رویا ہوگا سُن کر داستانِ کربلا

دودھ کی نہریں بھی قرباں، حوضِ کوثر بھی نثار
اِک تمہاری پیاس پر، اے تشنگانِ کربلا !

کتنا خوش قسمت ہے میرا دِل بھی، میری آنکھ بھی
یہ ثنا خوانِ نبیؐ، وہ سوز خوانِ کربلا

بے کسی کی لاج رکھ لی اور فارس ہوگئے
چارۂ بے چارگاں، بے چارگانِ کربلا

○

تمہیں خبر بھی ہے جو مرتبہ حُسینؑ کا ہے؟
فُرات چھیننے والو! خدا حُسینؑ کا ہے

کوئی سدا نہیں روتا بچھڑنے والوں کو
ثباتِ فرشِ عزا معجزہ حُسینؑ کا ہے

ازل سے تا بہ ابد نُور کے نشاں دو ہیں
اک آفتاب ہے، اِک نقشِ پا حُسینؑ کا ہے

جہاں بھی ذکر ہو، اشکوں کے گُل برستے ہیں
یہ احترام نبیؐ کا ہے یا حُسینؑ کا ہے

ذرا سا غور سے دیکھو شفق کی سرخی کو
فلک پہ خوں سے رقم سانحہ حُسینؑ کا ہے

مرے لبوں کو بھلا خوفِ تشنگی کیوں ہو؟
مرے لبوں پہ تو نعرہ ہی یا حُسینؑ کا ہے

ستارۂ سَحَری جس کو لوگ کہتے ہیں
فرازِ عرش پہ روشن دیا حُسینؑ کا ہے

شاہِ جوانانِ خُلد

شاہِ جوانانِ خُلد، بادشہِ مشرقین
لختِ دلِ مصطفیٰؐ یعنی ہمارے حُسَینؑ
اُن کا مکمل وجود نورِ نبیؐ کی نمود
اُن کا سراپا تمام عشقِ حقیقی کی عَین
ماں ہیں جنابِ بتولؑ، بنتِ رسولِ کریمؐ
باپ ہیں شیرِ خداؑ، فاتحِ بدر و حنین

ان کا امر معجزہ سوز و غمِ کربلا
آج بھی ہے گریہ ناک چشمِ نمِ کربلا

اصلِ سخا، عینِ حق، روحِ وفا، جانِ عشق
اسمِ امامِ حسینؑ چشمۂ فیضانِ عشق

فیض تو دیکھو ذرا نسبتِ مولائی کا
بن گئے اُن کے غلام خاصہٴ خاصانِ عشق
جن کو نہیں مِل سکی جائے اماں کوئی بھی
پہنچے درِ شاہ پر ہو گئے مہمانِ عشق

مرجعِ عُشّاق ہے آپ کا دَر، یا حسینؑ!
فارسِ خستہ پہ بھی ایک نظر، یا حسینؑ!

رُباعیات

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من
ویں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من و تو
چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

خیام

حسد

مجھ سے کوئی شکوہ ہے تو کر بسم اللہ
کیوں کاٹ رہا ہے تُو حسد کا چِلّہ ؟
کُڑھتا ہے شب و روز مجھے سوچ کے تُو
لاَحولَ وَلاَ قُوّتَ اِلاّ بِاللہ

بے بسی

محفل میں جو ہم تجھ سے پرے بیٹھے ہیں
بے بس ہیں سو اشکوں سے بھرے بیٹھے ہیں
فی الحال کوئی اور تواضع مت کر
ہم لوگ تو پہلے ہی مرے بیٹھے ہیں

یاد

گو رزق کے چکر نے بہت جور کیا
ہم پھرتے رہے ، صبر بہر طور کیا
شانوں پہ تری یاد کی چادر لے کر
یوں گھومے کہ ہر شہر کو لاہور کیا

عزم

بکھرے ہوئے اوراقِ خزانی چُن کر
لے جاؤں گا ایک ایک نشانی چُن کر
چھوڑوں گا نہیں کچھ بھی تری آنکھوں میں
کھو جاؤں گا ہر یاد پرانی چُن کر

دلاسا

ٹوٹے ہوئے دل کو یہ دِلاسا ہی سہی
گر عشق نہیں ، کھیل تماشا ہی سہی
اب کس کو ہے معیار کی پروا، پیارے !
گر تُو نہیں قسمت میں تو دُنیا ہی سہی

سوال

تجھ کو تھا یہ لالچ تری تعریف کروں
میری تھی تمنا کہ ترا لمس چکھوں
پھر کیوں ترے لالچ کو مِلے عشق لقب ؟
کیوں اپنی تمنا کا ہوس نام سنوں؟

بے نیازی

ہم جاں سے گئے آس لگائے ، ہائے
موجود تھے سب اپنے پرائے ، ہائے
خود سوزی کری ہم نے تمہاری خاطر
اور تم ہی نہیں دیکھنے آئے ، ہائے

بہادر

ہر اک کو خبردار چھٹی حس نے کیا
ڈر ڈر کے کیا کارِ وفا جس نے کیا
ہر شخص کو پیاری تھی بہت اپنی جان
کرتا کوئی کیا عشق جو فارس نے کیا

ریزہ ریزہ

مَیں نے کل طیش میں پتھر تو بہت مارے مگر
آسمانوں سے فقط ایک ستارہ ٹوٹا

☆

پھول بھی نقلی دیے اور عطر بھی جھوٹا دیا
بول، سچے عاشقوں نے اور تجھ کو کیا دیا؟

☆

نیا کرایے دار یہ سُن کر کانپ رہا ہے
اِس کمرے میں صدیوں تک اِک سانپ رہا ہے

☆

مَیں ایسا پیڑ ہوں جس کی تمام شاخوں پر
تمہاری یاد کی چڑیا پھدکتی رہتی ہے

اُداسی صحن کے کونے میں سمٹی سمٹائی
ہلے بِنا مجھے چپ چاپ تکتی رہتی ہے

چار شعروں کی مار ہے وہ شخص
لیکن اب میرا جی نہیں کرتا

☆

موت صدیوں سے تعاقب میں ہے لیکن فارس
زندگی اپنی حفاظت کا ہنر جانتی ہے

☆

سجدے میں آ گیا تھا کوئی اور ہی خیال
پڑھنا پڑی نمازِ محبت شروع سے

☆

یوں تو شہر میں دس مے خانے ہیں لیکن
تیری آنکھیں بھی گن لیں تو بارہ ہیں

☆

ہمارا بخت ہی ایسا کرخت نکلے گا
کہ ہم خریدیں تو ریشم بھی سخت نکلے گا

☆

مار ہی ڈالا کرو، طنز نہ فرمایا کرو
طنز دنیا پہ تو سجتا ہے مگر تم پہ نہیں

☆

بڑا کریم ہے وہ ہر شجر کو پھل دے گا
تجھے جمال دیا ہے، مجھے غزل دے گا

☆

مَیں ہجر زاد کہاں اور وصالِ یار کہاں
مگر جناب! تمنا پہ اختیار کہاں

نظر پڑی ہے تو جی بھر کے دیکھ لو فارس
وہ کم نما نظر آتا ہے بار بار کہاں

☆

تمام حالِ دلِ زار تُو تو جانتا ہے
مَیں کیا بتاؤں تجھے یار! تُو تو جانتا ہے

☆

وہی ماتھا، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ
تمہاری یاد بھی تم پر گئی ہے

مگر پھر ایک دن اُس سے ملا مَیں
مجھے لگتا تھا حیرت مر گئی ہے

گلی سے ہجر گذرا ہے یقیناً
محبت بیٹھے بیٹھے ڈر گئی ہے

☆

دل بضد تھا کہ مجھے غم سے پگھل جانے دے
پھر تری یاد نے سمجھایا کہ چل جانے دے

☆

دُگنے ہو جاتے ہیں غم ، دِل سے جو مَس ہوتے ہیں
دو سے چار، ایک سے دو، پانچ سے دس ہوتے ہیں
کیا کہا ؟ ہجر گذارا ہے ؟ چلو بتلاؤ
ایک لمحے میں بھلا کتنے برس ہوتے ہیں ؟

☆

کیے ہجّے ، پڑھی مَیں نے محبت
محبت ، میم حے بے تے ، محبت

☆

کچھ ایسے لمحۂ موجود میں پیوست ہے ماضی
پرندے اُڑ گئے، پھولوں پہ اُن کے سائے باقی ہیں

☆

سیاہ بستی سے جب محبت کی کھوج میں گھڑ سوار آئیں
تمہیں تمہاری قسم، مری آخری نشانی چُھپائے رکھنا

○

یہ راز مجھ پہ اچانک کھلا مدینے میں
کہ بے اثر نہیں جاتی دعا مدینے میں

مرا جواب مدینہ تھا، جب سوال ہوا
کہ تجھ کو خُلد میں رہنا ہے یا مدینے میں؟

پُکارتی ہے کوئی رحمتوں بھری آغوش
کہ عافیت کی طلب ہے تو آ مدینے میں

مَیں تیرہ بخت وہاں جا کے بھی پلٹ آیا
نصیبوں والا تھا دِل، رہ گیا مدینے میں

تمام باغوں کے سارے گلاب ماند پڑے
اک ایسا غنچۂ خضرا کھلا مدینے میں

O

چار حرفوں کی یہ ابجد حمد بھی ہے نعت بھی
صاحبو ! اسمِ محمدؐ حمد بھی ہے نعت بھی

ربِ کعبہ کی قسم ، یہ مسئلہ ہے عشق کا
بات یہ ہے ذکرِ احمدؐ حمد بھی ہے نعت بھی

تُو ثنائے مصطفٰےؐ کی کیفیت پر غور کر
اِس کی تو کوئی نہیں حد ، حمد بھی ہے نعت بھی

فنا کی رہگزر پہ منزلِ بقا حُسینؑ ہے
یہی ہے قصہ مختصر، یزید تھا حُسینؑ ہے

☆

زباں پر مصلحت، دل ڈرنے والا
بڑا آیا محبت کرنے والا

☆

تُم بھی ہو بیتے وقت کے مانند ہُو بہو
تُم نے بھی یاد آنا ہے، آنا تو ہے نہیں

☆

تُم مِلاتے ہو بچھڑے لوگوں کو
ایک میرا بھی یار ہے، سائیں!

☆

آپ کی آنکھیں اگر شعر سُنانے لگ جائیں
ہم جو غزلیں لیے پھرتے ہیں ٹھکانے لگ جائیں

☆

جب اُس کی زندگی میں کوئی اور آ گیا
تب مَیں بھی گاؤں چھوڑ کے لاہور آ گیا

☆

عشق وہ ساتویں حس ہے کہ عطا ہو جس کو
رنگ سُن جاویں اُسے، خوشبو دکھائی دیوے

☆

وہ روشنی تھی کہ آنکھیں تو اُٹھ نہیں پائیں
مَیں تیرے پاؤں سے جانا کہ روبرو تُو ہے

☆

رحمان فارس بسلسلۂ روزگار بیوروکریٹ اور بلحاظِ عشق شاعر ہیں۔ سول سروس سے تعلق ہے اور اِن دنوں ایڈیشنل کمشنر (ان لینڈ ریوینیو) لاہور تعینات ہیں۔

مقبولیت اور قبولیت کے لحاظ سے اِس وقت بلاشبہ اپنی نسل کے صفِ اوّل کے شعراء میں اعلیٰ ترین اور نمایاں ترین ہیں۔ غزل، نظم، مرثیہ، رُباعی، قطعات، تراجم، منظوم سفرناموں اور ہائیکو میں بھرپور اثر انگیزی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ عالمی مشاعروں کے سلسلے میں امریکہ، کینیڈا، یورپ کے بیشتر ممالک، مشرقِ وسطیٰ، ہندوستان، چین، بنگلہ دیش اور دیگر کئی ممالک میں ادبی فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکے ہیں۔ عصرِ حاضر میں سوشل میڈیا کے مقبول ترین، سب سے زیادہ پسندیدہ اور شیئر کیے جانے والے شاعر ہیں۔ اردو اور انگریزی نثر میں بھی یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ مؤقر انگریزی اخبارات میں کالم لکھتے رہے ہیں۔ متعدد ٹیلی ویژن پروگرامز میں اینکر رہ چکے ہیں۔ اہل وعیال کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں۔

''عشق بخیر'' اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کا دُنیا بھر میں اُن کے چاہنے والوں کو نہایت شدت سے انتظار تھا۔ رحمان فارس کی شاعری سے نوجوان نسل کی والہانہ محبت دیکھ کر ہمیں یقین ہے کہ سنگِ میل پبلی کیشنز سے چھپنے والا یہ مجموعہ انشاءاللہ مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرے گا۔

(ادارہ)

Rs. 900.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3163-9
ISBN-13: 978-969-35-3163-3
9 789693 531633

شاعری
ازالہ
اظہر فراغ

تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں
تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔

03448183736
03145951212

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ازالہ

اظہر فراغ

وراق پبلی کیشنز

وراق

سستی اور معیاری کتابیں

ادبی تنظیم مجلسِ وراق

25 سیکنڈ فلور، تاج آرکیڈ، بالمقابل سروسز ہسپتال لاہور

042-36525005

ہماری کوشش : کتاب دوستی ، فروغِ ادب

ازالہ

یہ کتاب **ازالہ** ادبی تنظیم مجلسِ وراق نے 2016 میں چھپوا کر آپ کی خدمت میں پیش کی
اس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے راول حسین سے 0301-6579483 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے

ISBN: 978-969-7688-05-0

اشاعت 2016 بار اول
قیمت 250
زیرِ اہتمام وراق
ادبی تنظیم مجلسِ وراق

انتساب

پیارے دوست محمد ندیم خان بھابھہ کے نام

انتساب

دیا مریم اور اس کی ماں کے نام

ترتیب

○ پلنگ ایک الگ لحاف
○ دوش دیتے رہے بے کار ہی طغیانی کو
○ یار بجا یار نہیں رہ گئے
○ شب فراق کا منظر نہیں بدلنے دیا
○ ترمیمِ خال وخد کا وسیلہ نہیں رہا
○ رنج انکار اٹھائیں گے نہیں
○ رو پڑے عرضِ حال سن کر کیا
○ سارا قرضِ ہنر چکا دیا ہے
○ سر پہ رکھی ہوئی دستار کسی اور کی تھی
○ ترے بعد کوئی بھی غم اثر نہیں کر سکا
○ مصالحت سے یہ قصہ نمٹ بھی سکتا ہے
○ محبتوں میں نئے طرزِ انتقام کی شام
○ مڑ کے تکتے نہیں پتوار کو لوگ
○ ایک طرف تقسیم اضافی ہو سکتی ہے
○ اب بھلے دیکھتا رہے جس کو
○ اسی لیے ترے دعووں پہ مسکرا رہے ہیں
○ بتا رہا ہے جھٹکنا تری کلائی کا
○ دھوپ میں سایہ بنے تنہا کھڑے ہوتے ہیں
○ ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ ابر چھانے سے

○ فکر و جنوں کی بحث ہو یا حرفِ ناقدانہ ہو

○ گو اس کا جرم تو نا قابل معافی ہے

○ ہوا کے رخ پہ دیا دھر نہیں گیا تھا میں

○ ہماری طرح محبت کا فلسفہ سمجھے

○ ہمارے بارے میں تجھ بھنور کو مغالطہ ہے

○ جو خوشی جو تیری رضا میاں تری خیر ہو

○ جاتے ہوئے نہیں رہا پھر بھی ہمارے دھیان میں

○ کمی ہے کون سی گھر میں دکھانے لگ گئے ہیں

○ کوئی بھی شکل بنا دیں ہمیں اجازت ہے

○ کوئی رستہ نکالنا پڑے گا

○ لگتا تو نہیں الماری سے

○ ایسی خوش قسمتی کا کیا کیجے

○ کوئی سلسلہ نہیں جاوداں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

○ بپا یہ ظلم کسی حال میں نہیں کرتے

○ بہت ہی مہنگی مجھے اپنی زندگانی پڑی

○ کوششیں کر کے دل برا کیا تھا

○ اس لیے مجھ کو میسر تو کہیں بھی نہیں ہے

○ چاہے آغاز اب انجام سے کرنا پڑ جائے

○ اسی منظر کو پھر دوبارہ بنا

○ چہرہ پھولوں کی طرح دھیان میں رکھا گیا ہے

○ کس کس سے کر کے اس کو خبر دار جانے دوں

○ کیوں نہ بے فکر ہو کے سویا جائے

○ ہر شیشے کا ڈر ہے بھیا

○ سوچا ہے کیا معاوضہ سائے کا آپ نے

○ اٹھ گیا رزق لا مکاں سے بھی

○ یہی نہیں کہ یہ تعبیر کا معاملہ ہے

○ کیا کچھ نہیں تھا بس میں مگر دل نہیں کیا

○ کتنا کہتے تھے تجھے بھائی سمجھ

○ جتنے دن چاہے وہ آ کر یہاں مہمان رہے

○ خاک اب ٹوٹے رشتے میں مضبوطی پہلے والی ہے

○ دیواریں چھوٹی ہوتی تھیں لیکن پردہ ہوتا تھا

○ مل گیا تو مجھے میرا نہیں رہنے دے گا

○ اس لب کی خامشی کے سبب ٹوٹتا ہوں میں

○ وہ جو اک شخص تھا اک ذات تھی ویسے نہیں تھی

○ عمر ہم لوگ کہاں کاٹتے ہیں

○ کوئی بھی شکل مرے دل میں اتر سکتی ہے

○ ہر شیشے کا ڈر ہے بھیا

○ سب کو تھوڑی مرا یقیں آیا

○ نظر کی حد سے نکل کر جمال دیکھنا تھا

○ فردیات

نعت

یہ مرحلہ ہے طلب کا نصیب کا نہیں ہے
وگرنہ کس پہ درِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھلا نہیں ہے

نظر سے دل کی مسافت پہ ہے مدینہ مجھے
کسی بھی دشت نوردی کا فائدہ نہیں ہے

اب اس سے بڑھ کے ہو تبلیغ کیا محبت کی
ترے عدو کو بھی تجھ سے کوئی گلہ نہیں ہے

یہ راز صرف ثنا خوان جانتے ہیں ترے
سخن کو ہے تری توصیف کو فنا نہیں ہے

ابھی وہ بابِ کرم مجھ پہ وا ہوا ہی تھا
میں یہ بھی بھول گیا میرے پاس کیا نہیں ہے

ترے سبب سے مرے رابطے میں رہتی ہے
وہ ایک ذات مرا جس سے سامنا نہیں ہے

سلام

بھلے کوئی بھی نہ تیار ہو وہاں ہو جاؤ
جہاں بھی ظلم سے انکار ہو وہاں ہو جاؤ

بغیر اوٹ کے جلتے ہوئے دیے کو سلام
جب اذن ہے جہاں دیوار ہو وہاں ہو جاؤ

یہاں کسی کو مراعات ملنے والی نہیں
اگر زیادہ سمجھدار ہو وہاں ہو جاؤ

ہمارے پاس سوائے دلیل کچھ بھی نہیں
تو جس کے ہاتھ میں تلوار ہو وہاں ہو جاؤ

حسین تیری اطاعت سے ہم نے سیکھا ہے
جہاں بھی راستہ دشوار ہو وہاں ہو جاؤ

کیسے دنیا کا جائزہ لیا جائے
دھیان تجھ سے اگر ہٹا لیا جائے

تیز آندھی میں یہ بھی کافی ہے
پیڑ تصویر میں بچا لیا جائے

یہ خموشی مری خموشی ہے
اس کا مطلب مکالمہ لیا جائے

ایک ہونے کی قسمیں کھائی جائیں
اور آخر میں کچھ دیا لیا جائے

ہم جسے چاہے اپنا کہتے رہیں
وہی اپنا ہے جس کو پا لیا جائے

کیوں نہ آج اپنی بے بسی کا فراغ
دور سے بیٹھ کر مزہ لیا جائے

باغ سے جھولے اتر گئے
سندر چہرے اتر گئے

وصل کے ایک ہی جھونکے میں
کان سے بالے اتر گئے

گھر میں کس کا پاؤں پڑا
چھت سے جالے اتر گئے

لٹک گئے دیوار سے ہم
سیڑھی والے اتر گئے

بھاگوں والی بستی تھی
جہاں پرندے اتر گئے

گاڑی پھر بھی رواں رہی
ہم پٹڑی سے اتر گئے

بھینٹ چڑھے تم عجلت کی
پیڑ سے کچے اتر گئے

ڈول وہیں پر پڑا رہا
چاہ میں پیاسے اتر گئے

تجھ سے کچھ اور تعلق بھی ضروری ہے مرا
یہ محبت تو کسی وقت بھی مر سکتی ہے

اچھے خاصے لوگوں پر بھی وقت اک ایسا آجاتا ہے
اور کسی پر ہنستے ہنستے خود پر رونا آجاتا ہے

کبھی کبھی تو اس کے پیار سے ہمدردی کی بو آتی ہے
کبھی کبھی تو اس کے پیار پہ مجھ کو غصہ آجاتا ہے

ویسے تو ایمان ہے میرا ان باہوں کی گنجائش پر
دیکھنا یہ ہے اس کشتی میں کتنا دریا آجاتا ہے

پھر اپنی آہستہ روی بھی زعم کا باعث بن جاتی ہے
انگلی تھام کے چلتے چلتے آخر چلنا آجاتا ہے

ہوتے ہوتے محرومی کی عادت کیسے ہو جاتی ہے
آدھا رزق ہمارے گھر میں کیسے پورا آجاتا ہے

وہ جو اک شخص مجھے طعنہء جاں دیتا ہے
مرنے لگتا ہوں تو مرنے بھی کہاں دیتا ہے

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

تم جسے آگ کا تریاق سمجھ لیتے ہو
دینے لگ جائے تو پانی بھی دھواں دیتا ہے

جم کے چلتا ہوں زمیں پر جو میں آسانی سے
یہ ہنر مجھ کو مرا بارِ گراں دیتا ہے

ہاں اگر پیاس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے
پھر تو پیاسے کو بھی آواز کنواں دیتا ہے

ٹھہرنا بھی مرا جانا شمار ہونے لگا
پڑے پڑے میں پرانا شمار ہونے لگا

بہت سے سانپ تھے اس غار کے دہانے پر
دل اس لیے بھی خزانہ شمار ہونے لگا

ہجوم سارا رہا کر دیا گیا لیکن
مرا ہی شور مچانا شمار ہونے لگا

پھر ایسے ہاتھ سے مانوس ہو گئی تسبیح
گنے بغیر بھی دانہ شمار ہونے لگا

وہ سنگ جس کو حقارت سے رات بھر دیکھا
سحر ہوئی تو سرہانا شمار ہونے لگا

بھلا ہو ان کا جو مجھ کو ترا سمجھتے ہیں
مرا بھی کوئی ٹھکانہ شمار ہونے لگا

تری فضیلت کو اس لئے بھی مرے حوالے سے جانا جائے
دیا ضروری ہے پہلے پہلے جلانے والے سے جانا جائے

بہت غنیمت ہیں ہم سے ملنے کبھی کبھی کے یہ آنے والے
وگرنہ اپنا تو شہر بھر میں مکان تالے سے جانا جائے

شجر سے میں نے جو شاخ کاٹی شجر بنانے کی ٹھان لی ہے
مری خطا کو خدارا اب تو مرے ازالے سے جانا جائے

یہی تو دریا کو ترک کر کے یہاں تک آنے میں مصلحت ہے
کہ میرے حصے کی تشنگی کو ترے پیالے سے جانا جائے

بڑی اذیت کے بعد آتا ہے آشنائی کا یہ قرینہ
جو خار رستے میں آئے اس کو اسی کے چھالے سے جانا جائے

بصارتوں کو بصیرتوں کی سند نوازی گئی ہے اظہر
یہی نہ ہو شہرِ کم نظر میں سفید کالے سے جانا جائے

بھنور سے یہ جو مجھے بادبان کھینچتا ہے
ضرور کوئی ہواؤں کے کان کھینچتا ہے

کسی بدن کی تمازت نڈھال کرتی ہے
کسی کے ہاتھ کا تکیہ تھکان کھینچتا ہے

دکھا رہا ہے خریدار بن کے آج مجھے
جسے لپیٹ کے رکھوں وہ تھان کھینچتا ہے

نشست کے تو طلب گار ہی نہیں ہم لوگ
ہمارے پاؤں سے کیوں پائدان کھینچتا ہے

بدل کے دیکھ چکی ہے رعایا صاحبِ تخت
جو سر قلم نہیں کرتا زبان کھینچتا ہے

یہ سارا جھگڑا ترے انہماک کا ہی تو ہے
سمیٹتا ہے کوئی داستان کھینچتا ہے

چراغوں میں وہ چراغ اس لیے نمایاں ہے
ہم ایسے دیکھنے والوں کا دھیان کھینچتا ہے

منظرِ شامِ غریباں ہے دمِ رخصتِ خواب
تعزیے کی طرح اٹھا ہے کوئی بستر سے

تنگیٔ رزق سے ہلکان رکھا جائے گا کیا
دو گھروں کا مجھے مہمان رکھا جائے گا کیا

تجھے کھو کر تو تری فکر بہت جائز ہے
تجھے پا کر بھی ترا دھیان رکھا جائے گا کیا

کس بھروسے پہ اذیت کا سفر جاری ہے
دوسرا مرحلہ آسان رکھا جائے گا کیا

خوف کے زیرِ اثر تازہ ہوا آئے گی
اب دریچے پہ بھی دربان رکھا جائے گا کیا

درد کا شجرہ دکھانے کے لیے مقتل میں
ساتھ خنجر کے نمک دان رکھا جائے گا کیا

چل ترا مان رکھا میں نے تقاضا چھوڑا
چپ رہوں گا تو مرا مان رکھا جائے گا کیا

مان بھی لے کہ تجھے میں نے بہت چاہا ہے
دوست سر پر مرے قرآن رکھا جائے گا کیا

وہ اک سخن جو زباں کو نہ دستیاب ہوا
وہ ایک پھول جسے شاخ سے اتارا نہیں

❀

ملاحوں کا تو بس دانہ پانی ہے
کشتی بھی اس کی ہے جس کا پانی ہے

پیاس کی پیدائش تو کل کا قصہ ہے
اس دھرتی کا پہلا بیٹا پانی ہے

رونے والے نے تاخیر سے کام لیا
لگتا ہے تالاب میں پچھلا پانی ہے

اس دریا کو ڈوب کے سننا پڑتا ہے
آوازوں سے ملتا جلتا پانی ہے

بڑی نہیں ہے ورنہ موج سمندر سے
اس کی خوبی یہ ہے چلتا پانی ہے

تیرے میرے کھیتوں کا یارانہ ہے
اور اک ہم ہیں اپنا جھگڑا پانی ہے

میں رواں دائرے میں رہ گیا ہوں
اس لیے راستے میں رہ گیا ہوں

ہر خسارے کو سوچ رکھا تھا
میں بہت فائدے میں رہ گیا ہوں

سر جھٹکنے سے کچھ نہیں ہو گا
میں ترے حافظے میں رہ گیا ہوں

گم ہوا تھا کسی پڑاؤ میں
دوسرے قافلے میں رہ گیا ہوں

میں جری تو عدو سے کم نہیں تھا
بس ذرا تجربے میں رہ گیا ہوں

میں کسی داستاں سے ابھروں گا
میں کسی تذکرے میں رہ گیا ہوں

ذرا سی دیر ٹھہر کر سوال کرتے ہیں
سفر سے آئے ہوؤں کا خیال کرتے ہیں

میں جانتا ہوں مجھے مجھ سے مانگنے والے
پرائی چیز کا جو لوگ حال کرتے ہیں

زمانہ ہو گیا حالانکہ دشت چھوڑے ہوئے
ہمارے تذکرے اب بھی غزال کرتے ہیں

وہ دستیاب ہمیں اس لیے نہیں ہوتا
ہم استفادہ نہیں دیکھ بھال کرتے ہیں

وہ عشق جس کے گنے جا چکے ہیں دن اظہر
ہم اس چراغ کی سانسیں بحال کرتے ہیں

✿

یہ بھی موسم کی کوئی سازش نہ ہو
ابر ہو لیکن یہاں بارش نہ ہو

اس قدر بھی چاہنا کیا چاہنا
عشق شدت سے ہو اور خواہش نہ ہو

ایسی غربت کو خدا غارت کرے
پھول بھجوانے کی گنجائش نہ ہو

تم تو یوں ضد پر اتر آئے ہو آج
آخری خواہش ہو فرمائش نہ ہو

گل کو خوشبو سے اگر ناپا گیا
عمر بھر ممکن ہے پیمائش نہ ہو

✿

پلنگ ایک الگ لحاف
قبولیت نہ انحراف

بچھڑنا چاہیئے ہمیں
تو یوں کہو نہ صاف صاف

اگر تو تیغ پھینک دے
تجھے مرا لہو معاف

ادھر ذرا سی بات کی
ادھر کسی کا موڈ آف

اتر کے جھیل میں بھی ہم
ہیں زیرِ آب ناف ناف

پرانی آشنائی پر
بہت بچے گا اختلاف

وہ کیا کتاب کھولتے
جو چومتے رہے غلاف

گرتے پیڑوں کی زد میں ہیں ہم لوگ
کیا خبر راستہ کھلے کب تک

❁

دوش دیتے رہے بے کار ہی طغیانی کو
ہم نے سمجھا نہیں دریا کی پریشانی کو

یہ نہیں دیکھتے کتنی ہے ریاضت کس کی
لوگ آسان سمجھ لیتے ہیں آسانی کو

بے گھری کا مجھے احساس دلانے والے
تو نے برتا ہے مری بے سرو سامانی کو

شرمساری ہے کہ رکنے میں نہیں آتی ہے
خشک کب تک کوئی کرتا رہے پیشانی کو

آپ سے کس نے طلب کی ہے جنوں پر رائے
چھوڑیئے آپ مری چاک گریبانی کو

جیسے رنگوں کی بخیلی بھی ہنر ہو اظہر
غور سے دیکھئے تصویر کی عریانی کو

یار بجا یار نہیں رہ گئے
راستے ہموار نہیں رہ گئے

خیر پرندے تو پلٹ آئیں گے
لوگ تو اس پار نہیں رہ گئے

تم جہاں تصویر بنے بیٹھے ہو
ہم وہاں دیوار نہیں رہ گئے

یہ تو ازالہ ہے نئے زخم کا
اور جو آزار نہیں رہ گئے

وقت سے پہلے ہوئے تیار ہم
وقت پہ تیار نہیں رہ گئے

شکر ہے اچھا ہے مرا حافظہ
ورنہ اب آثار نہیں رہ گئے

شبِ فراق کا منظر نہیں بدلنے دیا
کوئی چراغ جلایا نہ میں نے جلنے دیا

ہم اس کا ردِ عمل جانتے تھے پہلے سے
سو ہم نے گیند زیادہ نہیں اچھلنے دیا

دلیل اس کے دریچے کی پیش کی میں نے
کسی کو پتلی گلی سے نہیں نکلنے دیا

پھر اس کے بعد گلے سے لگا لیا میں نے
خلاف اپنے اسے پہلے زہر اگلنے دیا

یہ لوگ جا کے کٹی بوگیوں میں بیٹھ گئے
سمے کو ریل کی پٹڑی کے ساتھ چلنے دیا

ترمیمِ خال و خد کا وسیلہ نہیں رہا
کوزہ اتر کے چاک سے گیلا نہیں رہا

سائے کو رونے والے مسافر کو کیا خبر
پھل بھی اب اس شجر کا رسیلا نہیں رہا

اب تو ہمارے نام سے پہچانیے ہمیں
اب تو ہمارا کوئی قبیلہ نہیں رہا

آباد کر دیا ہے بگولوں نے دشت کو
اب رہگزر میں کوئی بھی ٹیلا نہیں رہا

نوکیلے پتھروں پہ زوال آ گیا فراغ
آہنگ آبجو کا سریلا نہیں رہا

رنجِ انکار اٹھائیں گے نہیں
سلسلہ اور بڑھائیں گے نہیں

موت کی دوسری کوشش پر لوگ
مرنے والے کو بچائیں گے نہیں

باز رہیے ابھی انگڑائی سے آپ
ورنہ تصویر میں آئیں گے نہیں

کیسے فطرت سے بغاوت کر لیں
خاک ہیں خاک اڑائیں گے نہیں

ہم اگر تیرا بھرم رکھ بھی لیں
لوگ لوگوں سے چھپائیں گے نہیں

ہم پلٹتا ہوا دیکھیں گے تمہیں
ہم چراغوں کو بجھائیں گے نہیں

فائدہ ترکِ مراسم کا فراغ
ہم اسے بھول تو پائیں گے نہیں

کون میرے رستے سے مجھ سے پہلے گزرا ہے
کس کی گردِ پا ہے جو میرے منہ کو آتی ہے

رو پڑے عرضِ حال سن کر کیا
ہاتھ سے گر گیا رسیور کیا

لوگ اٹھ اٹھ کے دیکھنے لگ جائیں
بیٹھ جاؤں ترے برابر کیا

آپ کے تجربے پہ حیرت ہے
ایسا ہوتا نہیں ہے اکثر کیا

مانگتے ہو مری نمو کا ثبوت
عینی شاہد نہیں ہیں پتھر کیا

ہم اگر اب کے سال بھی نہ ملے
پھر ادھیڑو گی تم سویٹر کیا

اس تبرک کو بھی غنیمت جان
جو میسر ہے اس سے بہتر کیا

سارا قرضِ ہنر چکا دیا ہے
لفظ کو راستہ بنا دیا ہے

بے خیالی میں جس کو پایا تھا
ڈھونڈنے میں اسے گنوا دیا ہے

احتیاطِ فصیل و در کیسی
جب کرایہ مکان کا دیا ہے

رک گئے ہیں جہاں سے روکا گیا
لگ گئے ہیں جہاں لگا دیا ہے

رت بدلنے کی دیر تھی اظہر
دھوپ نے چھاؤں کا مزہ دیا ہے

سر پہ رکھی ہوئی دستار کسی اور کی تھی
اصل میں ہار مری ہار کسی اور کی تھی

ہم تو بس اس میں سکونت کے گنہگار رہے
در کسی اور کا دیوار کسی اور کی تھی

ہم کو حاصل تھی تو بس پیڑ کی چھاؤں کچھ دیر
پیڑ پر شاخِ ثمر بار کسی اور کی تھی

میں نبرد آزما خود سے تھا بہت پہلے سے
رائے لیکن مجھے درکار کسی اور کی تھی

دستیابی کے سبھی مرحلے طے کر کے بھی
زندگی پھر بھی طلب گار کسی اور کی تھی

ترے بعد کوئی بھی غم اثر نہیں کر سکا
کوئی سانحہ مری آنکھ تر نہیں کر سکا

مجھے علم تھا مجھے کم پڑے گی یہ روشنی
سو میں انحصار چراغ پر نہیں کر سکا

مجھے جھوٹ کے وہ جواز پیش کیے گئے
کسی بات پر میں اگر مگر نہیں کر سکا

مرے آس پاس کی مفلسی مری معذرت
ترا انتظام میں اپنے گھر نہیں کر سکا

کئی پیکروں کو مرے خیال نے شکل دی
جنہیں رونما مرا کوزہ گر نہیں کر سکا

مجھے چال چلنے میں دیر ہوگئی اور میں
کوئی ایک مہرہ ادھر ادھر نہیں کر سکا

مصالحت سے یہ قصہ نمٹ بھی سکتا ہے
لباس صلح کرانے میں پھٹ بھی سکتا ہے

تم اپنے کرب کا اظہار کر بھی سکتی ہو
پیاز کاٹ کے یہ وقت کٹ بھی سکتا ہے

تو جس کی فتح کے نعرے لگانا چاہتا ہے
خراج لے کے وہ لشکر پلٹ بھی سکتا ہے

ہے اختیار میں تھوڑی گناہِ عالم وجد
کسی سے آدمی جا کر لپٹ بھی سکتا ہے

اگر تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے جنگل میں
یہ خیمہ حسبِ ضرورت سمٹ بھی سکتا ہے

مجبتوں میں نئے طرزِ انتقام کی شام
کسی کے ساتھ گزاری کسی کے نام کی شام

ازالہ ہو گیا تاخیر سے نکلنے کا
گزر گئی ہے سفر میں مرے قیام کی شام

نہ کوئی خواب دکھایا نہ کوئی عہد کیا
بدن ادھار لیا بھی تو اس سے شام کی شام

مسافروں کے لیے دشت کیا سرائے کیا
ہمیں تو ایک سی لگتی ہے ہر مقام کی شام

مٹائے گی مری تکمیل کی سحر مجھ کو
بنا رہی ہے مجھے میرے انہدام کی شام

مڑ کے تکتے نہیں پتوار کو لوگ
ایسے جاتے ہیں ندی پار کو لوگ

سائے کا شکر ادا کرنا تھا
سجدہ کرتے رہے دیوار کو لوگ

میں تو منزل کی طرف دیکھتا ہوں
دیکھتے ہیں مری رفتار کو لوگ

آئنہ میرے مقابل لائے
خوب سمجھے مرے معیار کو لوگ

نام لکھتے ہیں کسی کا لیکن
دکھ بتاتے نہیں اشجار کو لوگ

ایک طرف تقسیم اضافی ہو سکتی ہے
ماں سے بھی تو ناانصافی ہو سکتی ہے

مری نمو ہے ترے تغافل سے وابستہ
کم بارش بھی مجھ کو کافی ہو سکتی ہے

ان پھولوں کی پتی پتی زہریلی ہے
لیکن ان کی خوشبو شافی ہو سکتی ہے

صدیوں سے ساحل پہ رکھا میں خالی کوزہ
بھرنے سے بھی کہاں تلافی ہو سکتی ہے

اس پیچیدہ رشتے میں آسانی یہ ہے
حسبِ ضرورت وعدہ خلافی ہو سکتی ہے

اب بھلے دیکھتا رہے جس کو
نظر آئے نہ ہم کھڑے جس کو

ہائے وہ بھیگا ریشمی پیکر
تولیہ کھردرا لگے جس کو

دل کو اتنا سجا کے پھینکا ہے
چوم کر رکھ نہ دے ملے جس کو

کم نگاہو یہی مناسب ہے
دور جتنا دیا پڑے جس کو

ہم اسے پوچھ تھوڑی سکتے ہیں
اسکی مرضی جہاں رکھے جس کو

کرچی کرچی سمیٹتا ہوں اسے
توڑ دیتے ہیں آئینے جس کو

شاہزادی ہو یا کنیز فراغ
رنگ اس شوخ کا جچے جس کو

اب تو اس شخص سے بھی ترکِ تعلق ہے محال
تیرے دھوکے میں جسے دل سے لگایا ہوا ہے

اسی لیے ترے دعوؤں پہ مسکرا رہے ہیں
ہم اپنا ہاتھ تری پشت سے اٹھا رہے ہیں

بس اپنی خوش نظری کا بھرم رکھا ہوا ہے
شکستہ آئینے ترتیب سے لگا رہے ہیں

وہ خود کہاں ہے جو نغمہ سرا ہے صدیوں سے
یہ کون ہیں جو فقط اپنے لب ہلا رہے ہیں

ہوئے ہیں دیر سے ہموار زندگی کے لیے
ضرور ہم کسی لشکر کا راستہ رہے ہیں

ابھی کسی کی خوشی میں شریک ہونا ہے
ابھی کسی کے جنازے سے ہو کے آ رہے ہیں

بتا رہا ہے جھٹکنا تری کلائی کا
ذرا بھی رنج نہیں ہے تجھے جدائی کا

اور ایک ہم ہیں کہ ہموار کر رہے ہیں زمیں
زمانہ آ بھی چکا فصل کی کٹائی کا

تری طلب کے قرینے کو داد دیتا ہوں
گمان میری سخاوت پہ ہے گدائی کا

میں زندگی کو کھلے دل سے خرچ کرتا تھا
حساب دینا پڑا مجھ کو پائی پائی کا

کسی کے گھر میں گرے گیند کی طرح اظہر
عطا ہوا ہے ہمیں سلسلہ رسائی کا

دھوپ میں سایہ بنے تنہا کھڑے ہوتے ہیں
بڑے لوگوں کے خسارے بھی بڑے ہوتے ہیں

ایک ہی وقت میں پیاسے بھی ہیں سیراب بھی ہیں
ہم جو صحراؤں کی مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں

یہ جو رہتے ہیں بہت موج میں شب بھر ہم لوگ
صبح ہوتے ہی کنارے پہ پڑے ہوتے ہیں

ہجر دیوار کا آزار الگ اپنی جگہ
اس کے اوپر بھی کئی کانچ جڑے ہوتے ہیں

آنکھ کھلتے ہی جبیں چومنے آجاتے ہیں
ہم اگر خواب میں بھی تم سے لڑے ہوتے ہیں

ہے ملال ایسے ہمیں باغ کی ویرانی کا
جیسے ہم لوگ درختوں سے جھڑے ہوتے ہیں

ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ ابر چھانے سے
وہ آئی بام پہ کیا دھوپ کے بہانے سے

وہ قصہ گو تو بہت جلد باز آدمی تھا
بہت سی لکڑیاں ہم رہ گئے جلانے سے

نظر تو ڈال روانی کی استقامت پر
یہ آبشار ہے کہسار کے گھرانے سے

مسافرانِ محبت سے مجھے معاف کریں
میں باز آیا انہیں راستہ دکھانے سے

اگر میں آخری بازی نہ کھیلتا اظہر
تو خالی ہاتھ نہ آتا قمار خانے سے

فکر و جنوں کی بحث ہو یا حرفِ ناقدانہ ہو
غالب کو رد تو وہ کرے پہلے جو خود یگانہ ہو

مجھ سے سبک خرام کا ہونا ہے ہمسفر تجھے
چلنا ہے میرے ساتھ تو یوں کر کہ تو روانہ ہو

آرائش خیال کی خوبی یہی تضاد ہے
کچھ کچھ بہت جدید ہو کچھ کچھ بہت پرانا ہو

اپنی اڑائی خاک کو یکجا کروں گا چاک پر
ممکن ہے عذرِ عشق سے تدبیرِ آب و دانہ ہو

پیشہ ورانِ عشق و شوق کیجے نہ وقت رائگاں
ایسا کھنڈر نہیں ہوں میں جس میں کوئی خزانہ ہو

گو اس کا جرم تو نا قابل معافی ہے
خود آ گیا ہے مرے پاس چل کے کافی ہے

غلط نہ جان مری دوسری محبت کو
یقین کر یہ ترے ہجر کی تلافی ہے

ہر ایک شے کی ضرورت بلا ضرورت ہے
ہوس نہ ہو تو یہ لگتا ہے سب اضافی ہے

عجیب ظرف ہے اظہر مرے بزرگوں کا
کہ حق پہ بولنا تہذیب کے منافی ہے

ہوا کے رخ پہ دیا دھر نہیں گیا تھا میں
بچھڑ گیا تھا کوئی مر نہیں گیا تھا میں

یہ اور بات کہ میں نامراد لوٹ آیا
مگر قطار میں لگ کر نہیں گیا تھا میں

سبھی نے دیکھا مجھے اجنبی نگاہوں سے
کہاں گیا تھا اگر گھر نہیں گیا تھا میں

ہوا ضرور تھا اوجھل نگاہ سے لیکن
گئے ہوؤں کے برابر نہیں گیا تھا میں

پرائے کرب کی تحویل میں دیا گیا تھا
خوشی سے آگ کے اندر نہیں گیا تھا میں

مرے خلا پہ زمانوں کی گرد صرف ہوئی
پلک جھپکتے ہوئے بھر نہیں گیا تھا میں

ہماری طرح محبت کا فلسفہ سمجھے
نئے سے کون پرانے کو دیر پا سمجھے

اسے کہو جو بلاتا ہے گہرے پانی میں
کنارے سے بندھی کشتی کا مسئلہ سمجھے

ہمارا کیا ہے ہمیں تو فرار چاہیے تھا
دراڑ تھی جسے ہم بابِ نیم وا سمجھے

مجھے پتہ ہے کہ کس در کو کھٹکھٹانا ہے
مری طلب کو زمانہ مری عطا سمجھے

بچھڑنے پر مجھے مجبور کر دیا گیا تھا
یہ اور بات کوئی اس کو فیصلہ سمجھے

تعین اس لیے ہم کو ہے سہل سمتوں کا
اندھیرے میں تری آواز کو دیا سمجھے

ہمارے بارے میں تجھ بھنور کو مغالطہ ہے
ہمیں کسی کی اداس آنکھوں کا تجربہ ہے

گھٹن تو ہو گی نئی نئی راہداریوں میں
مگر حویلی کا ایک کمرہ بہت کھلا ہے

روا روی میں کہانی سنتے چلے گئے ہیں
یہ بات ویسے سنانے والا بھی جانتا ہے

ہوا تو آتی ہے خشک شاخوں سے چھن کے لیکن
شجر ضعیفی کے مارے مجھ پر جھکا ہوا ہے

بتانا پڑتا ہے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر
کہ کتنا مشکل ہماری آنکھوں سے دیکھنا ہے

تو کیا ہوا جو ہمیں بھی درپیش ہے مسافت
یہ ناؤ یوں بھی سمندروں کی ملازمہ ہے

جو خوشی جو تیری رضا میاں تری خیر ہو
تو بچھڑ رہا ہے تو جا میاں تری خیر ہو

خبر آ نہیں رہی خیر کی کسی سمت سے
مجھے جب سے اس نے کہا میاں تری خیر ہو

کہیں یہ نہ ہو کوئی تجھ شجر کو بھی کاٹ دے
تو بچا ہے گھر میں بڑا میاں تری خیر ہو

مجھے مت بتا کہ یہ رات پھر نہیں آئے گی
مجھے دھوکہ دے کے سلا میاں تری خیر ہو

تری بزم میں مرا یوں بھی کون ہے آشنا
بھلے جوتیوں پہ بٹھا میاں تری خیر ہو

تو عدو نہیں تو مرے حساب میں دوست ہے
ترے نام سے مجھے کیا میاں تری خیر ہو

جاتے ہوئے نہیں رہا پھر بھی ہمارے دھیان میں
دیکھی بھی ہم نے مچھلیاں شیشے کے مرتبان میں

ساتھ ضعیف باپ کے لگ گئیں کام کاج پر
گہنے چھپا کے لڑکیاں دادی کے پان دان میں

گھنٹی بجا کے بھاگتے بچوں کو تھوڑی علم ہے
رہتا نہیں ہے کوئی بھی آدمی اس مکان میں

پہلے بھی اپنی جھولیاں جھاڑ کر اٹھ گئے تھے ہم
ایسی ہی ایک رات تھی ایسی ہی داستان میں

یعنی مجال کچھ نہیں ذروں کے اجتماع کی
یعنی سبھی مہ و نجوم ایک ہی خاندان میں

اتنا بھی مختلف نہیں میرا تمہارا تجربہ
جیسے کہ تم مقیم ہو اور کسی جہان میں

کمی ہے کون سی گھر میں دکھانے لگ گئے ہیں
چراغ اور اندھیرا بڑھانے لگ گئے ہیں

یہ اعتماد بھی میرا دیا ہوا ہے تجھے
جو میرے مشورے بے کار جانے لگ گئے ہیں

فضا بدل گئی اندر سے ہم پرندوں کی
جو بول تک نہیں سکتے تھے گانے لگ گئے ہیں

وہ پہلے تنہا خزانے کے خواب دیکھتا تھا
اب اپنے ہاتھ بھی نقشے پرانے لگ گئے ہیں

نہیں بعید کہ جنگل میں شام پڑ جائے
ہم ایک پیڑ کو رستہ بتانے لگ گئے ہیں

کہیں ہمارا تلاطم تھمے تو فیصلہ ہو
ہم اپنی موج میں کیا کیا بہانے لگ گئے ہیں

کوئی بھی شکل بنا دیں ہمیں اجازت ہے
ہمارا مسئلہ معدوم کی وضاحت ہے

مجھے بھی ناؤ میں گننے کا شکریہ لیکن
قریب کا یہ جزیرہ برائے خلقت ہے

یہ کچے سیب چبانے میں اتنے سہل نہیں
ہمارا صبر نہ کرنا بھی ایک ہمت ہے

ہیں نرخ ایک سے بازارِ حسن و حرمت کے
وہی بدن کی وہی پیرہن کی قیمت ہے

بچا نہیں کوئی مصرف کسی اجالے کا
چراغ کے لیے بے کار کی اذیت ہے

کوئی رستہ نکالنا پڑے گا
آگ میں ہاتھ ڈالنا پڑے گا

خود کو تیرے سپرد کیا کیجے
پھر تجھے بھی سنبھالنا پڑے گا

ایک خط ہے خطوں میں رکھا ہوا
سارا ماضی کھنگالنا پڑے گا

مانگنے میں اگر کمی نہ ہوئی
کم سے کم پر تو ٹالنا پڑے گا

مسکرانا سکھا رہا ہوں تجھے
اب ترا دکھ بھی پالنا پڑے گا

لگتا تو نہیں الماری سے
وہ شخص گیا تیاری سے

سچ پوچھ تو بے ایمانی ہے
ہر عشق دیانتداری سے

تاخیر گوارہ کر لیتے
تو بچ جاتے دشواری سے

کچھ پھول ابھرے خود کاغذ پر
کچھ ابھرے نقش نگاری سے

کیوں بات بڑھانا چاہتے ہو
تم اپنی کم گفتاری سے

اظہر ہم دور کے چوروں کو
ہلکا بہتر ہے بھاری سے

ایسی خوش قسمتی کا کیا کیجے
تو نہیں تو کسی کا کیا کیجے

ہاتھ پتھر سے ہو گئے مانوس
شوقِ کوزہ گری کا کیا کیجے

اب تو اقرار بھی نہیں درکار
اب تری خامشی کا کیا کیجے

میرا شوقِ طلب ہی اتنا ہے
تیری دریا دلی کا کیا کیجے

کچھ نہیں دے رہا سجھائی ہمیں
اس قدر روشنی کا کیا کیجے

آئنہ ڈھانپیے اگر بالفرض
دوسرے آدمی کا کیا کیجے

❁

کوئی سلسلہ نہیں جاوداں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی
میں تو ہر طرح سے ہوں رائگاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

مرے ہم نفس تو چراغ تھا تجھے کیا خبر مرے حال کی
کہ جیا میں کیسے دھواں دھواں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

نہ ترا وصال وصال تھا نہ تری جدائی جدائی ہے
وہی حالتِ دلِ بدگماں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

میں یہ چاہتا ہوں کہ عمر بھر رہے تشنگی مرے عشق میں
کوئی جستجو رہے درمیاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

مرے نقشِ پا تجھے دیکھ کر یہ جو چل رہے ہیں انہیں بتا
ہے مرا سراغ مرا نشاں ترے ساتھ بھی ترے بعد بھی

بپا یہ ظلم کسی حال میں نہیں کرتے
گھروں کے فیصلے چوپال میں نہیں کرتے

ہمارے ہاتھ کی ریکھاؤں میں خلل ہو گا
پرندے دھوکہ اگر فال میں نہیں کرتے

محبت اپنی جگہ بام و در سے میرے عزیز
مگر یہ تجربہ بھونچال میں نہیں کرتے

ہم اپنی نیکی سمجھتے تو ہیں تجھے لیکن
شمار نامہ ءاعمال میں نہیں کرتے

یہ رات جتنے فسانوں کی مرتکب ہے فراغ
گناہ اتنے تو ہم سال میں نہیں کرتے

بہت ہی مہنگی مجھے اپنی زندگانی پڑی
وہ اس لئے کہ ترے ہجر میں بتانی پڑی

کچھ اتنا سہل نہ تھا روشنی سے بھر جانا
نظر دیے پہ بڑی دیر تک جمانی پڑی

خطوں کو کھولتی دیمک کا شکریہ ورنہ
تڑپ رہی تھی لفافوں میں بے زبانی پڑی

قدم قدم پہ ہزیمت کا سامنا ہے مجھے
قدم قدم پہ اگرچہ ہے کامرانی پڑی

مری انا کے تقاضے نہ ہو سکے پورے
میں سر اٹھا کے چلا تو نظر جھکانی پڑی

پرانے غم پہ نئی مے ہے بے اثر اظہر
کہیں سے ڈھونڈ کے لائے کوئی پرانی پڑی

کوششیں کر کے دل برا کیا تھا
اس پرندے کو جب رہا کیا تھا

ہم سے سرزد ہوا تھا کارِ خیر
کیا بتائیں کہ ہم نے کیا کیا تھا

میں نے اک دن بٹھا کے بچوں کو
اپنے اجداد کا گلہ کیا تھا

کم اذیت میں جان چھوٹ گئی
اپنے قاتل سے مشورہ کیا تھا

خاک سے جتنا زہر جذب کیا
اپنی شاخوں سے رونما کیا تھا

ویسے وہ میری دسترس میں تھا
احتیاطاً محاصرہ کیا تھا

اس لیے مجھ کو میسر تو کہیں بھی نہیں ہے
خواب تو خواب حقیقت کا یقیں بھی نہیں ہے

ہم تو دریا کو بھی مجرم نہیں ٹھہرا سکتے
ڈوبنے والا کنارے کے قریں بھی نہیں ہے

ہائے اس شخص کا ایمان کہ کافر کر دے
بد عقیدہ بھی ہے اور منکرِ دیں بھی نہیں ہے

کیجئے کیسے بھلا اس کے تغافل کا ملال
حسنِ انکار تو یہ ہے کہ نہیں بھی نہیں ہے

تم تو کہتے تھے کہ افلاک کشادہ ہوں گے
پاؤں دھرنے کو یہاں پر تو زمیں بھی نہیں ہے

چاہے آغاز اب انجام سے کرنا پڑ جائے
جی اٹھیں ہمکو اگر آپ پہ مرنا پڑ جائے

بھیگے بالوں کو سنبھال اور نکل جنگل سے
اس سے پہلے کہ ترے پاؤں یہ جھرنا پڑ جائے

کٹ کے جینا ہے تری ذات سے ایسے جیسے
خود بخود ہوتے ہوئے کام کو کرنا پڑ جائے

کچھ ٹھہرتا نہیں اس ٹوٹے ہوئے برتن میں
دل دوبارہ نہ کہیں چاک پہ دھرنا پڑ جائے

کتنا مشکل ہے اگر کوئے محبت سے مجھے
کارِ دنیا کے ارادے سے گزرنا پڑ جائے

اسی منظر کو پھر دوبارہ بنا
جھیل کے وسط میں کنارہ بنا

چھاؤں کا حق ادا کیا میں نے
گرتی دیوار کا سہارا بنا

ہم ابھی ممکنات سوچتے تھے
دیکھتے دیکھتے نظارہ بنا

ایک چھتری کی چھاؤں میں بیٹھے
کچھ ہمارا نہ کچھ تمھارا بنا

ہم محبت سمجھ رہے تھے جسے
اپنی خاطر کوئی ہمارا بنا

آتش نارسا نہ یاد رہی
ہاتھ ملتے ہوئے شرارہ بنا

چہرہ پھولوں کی طرح دھیان میں رکھا گیا ہے
اس کی تصویر کو گلدان میں رکھا گیا ہے

اس غرض سے کہ مری واپسی ممکن ہو جائے
ایک تعویذ بھی سامان میں رکھا گیا ہے

حکمِ اقرارِ اطاعت ہے. بہت بعد کی بات
کفر پہلے مرے ایمان میں رکھا گیا ہے

مر گئے جس کے بھروسے پہ جری، وہ مرہم
زخمیوں کے لیے میدان میں رکھا گیا ہے

رستہ چھوڑا ہی نہیں اس نے کوئی میرے لیے
یعنی پنجرہ مرا زندان میں رکھا گیا ہے

کس کس سے کر کے اس کو خبردار جانے دوں
اندھے کو کیسے تنہا سڑک پار جانے دوں

دفتر سے مل نہیں رہی چھٹی وگرنہ میں
بارش کی ایک بوند نہ بے کار جانے دوں

جی چاہتا ہے کھول دوں اندر سے کنڈیاں
ویرانی سوئے رونق بازار جانے دوں

اس رسہ کشی پہ ڈھیل کا احسان کچھ نہیں
کب تک میں درگزر کروں ہر بار جانے دوں

کیوں نہ بے فکر ہو کے سویا جائے
اب بچا کیا ہے جس کو کھویا جائے

ایک فہرستِ رفتگاں ہے میاں
رویا جائے تو کس کو رویا جائے

استفادہ عقب کے پانی سے
اور منہ آئنے سے دھویا جائے

میں تو خود سے فرار چاہتا ہوں
خود میں تجھ کو کہاں سمویا جائے

کوئی تو نام ہو تعلق کا
کس حوالے سے بوجھ ڈھویا جائے

ہم ضروری نہیں سمجھتے فراغ
عشق تسبیح میں پرویا جائے

ہر شیشے کا ڈر ہے بھیا
بچوں والا گھر ہے بھیا

عینک کا واویلا کرنا
ٹھوکر سے بہتر ہے بھیا

بس تم اپنے خواب سمیٹو
جس کا بھی بستر ہے بھیا

بھابی کے کنگن تھوڑی ہیں
بہنوں کا زیور ہے بھیا

میں جو تم کو خوش دکھتا ہوں
پردے کی جھالر ہے بھیا

سوچا ہے کیا معاوضہ سائے کا آپ نے
کہہ تو دیا شجر کو کرائے کا آپ نے

لگتا ہے واپسی کا ارادہ نہیں رہا
نقشہ بدل دیا ہے سرائے کا آپ نے

اپنی جگہ بجا ہے کہانی کا اختتام
مطلب غلط لیا ہے کنائے کا آپ نے

شاہی نہیں ہے منصبِ ساقی ہے یہ جناب
رکھا ہے فرق اپنے پرائے کا آپ نے

احمق لگے ہوئے ہیں عبث بھاگ دوڑ میں
دامن بھرا ہے بیٹھے بٹھائے کا آپ نے

اٹھ گیا رزق لا مکاں سے بھی
اب چلا جائے کیا یہاں سے بھی

ہونے والا نہیں یہ قصہ تمام
موڑ دیجے ورق جہاں سے بھی

پھول تیروں کی زد سے بچ نکلا
خوشبو آنے لگی کماں سے بھی

شکل آئندگاں بنا رہے ہیں
مشورہ ہو گا رفتگاں سے بھی

جانثاروں کو پوچھنا ہی پڑا
کمک آئے گی آسماں سے بھی

وقتِ آغاز و اختتام کے عشق
آ کریں تجھ کو درمیاں سے بھی

اتنا معصوم بھی نہیں ہے وہ
دینے پڑتے ہیں اس کو جھانسے بھی

تمام الفاظ کے معانی بدل گئے ہیں
وہ اپنے چہرے پہ سو گئی ہے کتاب رکھ کر

یہی نہیں کہ یہ تعبیر کا معاملہ ہے
ہمارے خواب کی توقیر کا معاملہ ہے

چلا تو لیتا میں کام ایک آدھ اشک سے بھی
مگر یہاں غمِ شبیر کا معاملہ ہے

اسے بھی اس کے مسائل نے روک رکھا ہے
ہمارے ساتھ بھی تقدیر کا معاملہ ہے

کرے تو کیسے کرے بھائی بھائی کو تسلیم
یہ خون کا نہیں جاگیر کا معاملہ ہے

تمھاری ذات کے ملبے کا کیا کروں گا میں
جہاں تلک مری تعمیر کا معاملہ ہے

معاصرینِ غزل سے معافی چاہتا ہوں
یہ حرمتِ ہنرِ میر کا معاملہ ہے

کیا کچھ نہیں تھا بس میں مگر دل نہیں کیا
کھونے کے خوف سے اسے حاصل نہیں کیا

محسوس کرلیا تھا بھنور کی تھکان کو
یونہی تو خود کو رقص پہ مائل نہیں کیا

خود پر حرام سمجھا ثمر کے حصول کو
جب تک شجر کو چھاؤں کے قابل نہیں کیا

چھو کر وہ خال و خد گئے کوزہ گری کو ہم
تاثیرِ لمس یار کو زائل نہیں کیا

جاگے ہوؤں سے بڑھ کے ہمیں باخبر سمجھ
ہمکو ہماری نیند نے غافل نہیں کیا

کتنا کہتے تھے تجھے بھائی سمجھ
آئی یا اب بھی نہیں آئی سمجھ

پر کشائی میں بنے ہوں گے صلیب
ان پرندوں کو نہ عیسائی سمجھ

کھلے پنجرے کی سہولت پہ نہ جا
مری غفلت مری دانائی سمجھ

شعر کے لوگ نہیں شور کے لوگ
تو بھلے اس کو پزیرائی سمجھ

چاہے مت کر مجھے اپنوں میں شمار
اپنی تنہائی کو تنہائی سمجھ

عمر مت پوچھ کنویں کی اظہر
چھو کے کوزوں پہ جمی کائی سمجھ

جتنے دن چاہے وہ آ کر یہاں مہمان رہے
سر پہ، ہم اس کا اٹھانے سے تو سامان رہے

کل اثاثے کی میاں ایک ہی گٹھڑی نہ بنا
تا کہ ہر ٹوٹی ہوئی چیز کی پہچان رہے

تجھ سے درکار محبت ہے محبت کے عوض
میں نہیں چاہتا تجھ پر کوئی احسان رہے

موسم ہجر میں پھولوں کی عمل داری نہ تھی
اک اذیت میں مری میز پہ گلدان رہے

جس طرح زندگی بیمار کا بستر ہو فراغ
آدمی اپنی ہی کروٹ سے پریشان رہے

خاک اب ٹوٹے رشتے میں مضبوطی پہلے والی ہے
پھر لگتا ہے اس مصرعے پر گرہ لگانے والی ہے

کھڑکی سے دکھتے پیڑوں کی سست روی سے لگتا ہے
اگلا سفر ہمیں کرنا ہے گاڑی رکنے والی ہے

ندی کنارے وقت بتانے والوں کو سمجھائے کون
اک پاگل کی کاغذی کشتی کھول کے پڑھنے والی ہے

آنکھوں کے انبار لگے ہیں نیم کھلے دروازوں میں
جیسے گاؤں کی گلیوں سے بارات گزرنے والی ہے

دھیرے دھیرے تان رہے ہیں ہم بھی کمبل چہرے پر
ٹی وی کی آواز کو وہ بھی مدھم کرنے والی ہے

شرم نہیں آتی کیا تم کو عشق کی دعوے داری پر
باتیں دشت نوردی کی اور خواہش خیمے والی ہے

گھاس سمجھ کر آپ ہرے قالین پہ اپنے پاؤں دھریں
باغ کی گنجائش بھی بالکل میرے کمرے والی ہے

گرچہ بہتات میں دیا گیا ہے
حق بھی خیرات میں دیا گیا ہے

✿

دیواریں چھوٹی ہوتی تھیں لیکن پردہ ہوتا تھا
تالے کی ایجاد سے پہلے صرف بھروسا ہوتا تھا

کبھی کبھی آتی تھی پہلے وصل کی لذّت اندر تک
بارش ترچھی پڑتی تھی تو کمرا گیلا ہوتا تھا

شکر کرو تم اس بستی میں بھی اسکول کُھلا، ورنہ
مر جانے کے بعد کسی کا سپنا پورا ہوتا تھا

جب تک ماتھا چوم کے رخصت کرنے والی زندہ تھی
دروازے سے باہر تک بھی منہ میں لقمہ ہوتا تھا

بَھلے زمانے تھے جب شعر سہولت سے ہو جاتے تھے
نئے سخن کے نام پہ اظہؔر میؔر کا چربہ ہوتا تھا

مل گیا تو مجھے میرا نہیں رہنے دے گا
وہ سمندر مجھے قطرہ نہیں رہنے دے گا

اس کو شک ہے کہ بھنور سے ہیں مراسم میرے
اب وہ پانی پہ سفینہ نہیں رہنے دے گا

مجھ کو معلوم تھا آسانی سے کھلتا ہوا در
واپسی کے لیے رستہ نہیں رہنے دے گا

لمحہ بھر کار جہاں بچھڑے ہوئے یاروں کو
جوڑ بھی دے گا تو یکجا نہیں رہنے دے گا

حسب حاصل کہیں موجود نہ ہونا میرا
سب کا ہو کر بھی کسی کا نہیں رہنے دے گا

تو جو حق میں مرے تلوار بنا پھرتا ہے
رہنے بھی دے گا مجھے یا نہیں رہنے دے گا

❀

اس لب کی خامشی کے سبب ٹوٹتا ہوں میں
دست دعا میں رکھا ہوا آئنہ ہوں میں

اب جا کے ہو سکے گی محبت وثوق سے
خود سے بچھڑتے وقت کسی سے ملا ہوں میں

آباد ہے خزانے کی افواہ سے وجود
متروک جنگلوں کا کوئی راستہ ہوں میں

دستار کاغذی ہے فضیلت ہے نام کی
چھوٹوں کی مہربانی سے گھر میں بڑا ہوں میں

رو کر نہ سویا جائے تو کیا نیند کا جواز
بستر کی ہر شکن میں پڑا جاگتا ہوں میں

ہوں اپنی روشنی کی اذیت میں مبتلا
جلتا ہوا چراغ ہوں الٹا پڑا ہوں میں

وہ جو اک شخص تھا اک ذات تھی ویسے نہیں تھی
خواب میں اس سے ملاقات تھی ویسے نہیں تھی

میں نے تاخیر کو تدبیر بنا رکھا تھا
چال چلتے ہی مری مات تھی ویسے نہیں تھی

سب مرے حسن تخیل کا بنایا ہوا تھا
زندگی حسب خیالات تھی ویسے نہیں تھی

میرا رونا کوئی اشکوں کا دکھاوا نہیں تھا
اندر اندر کوئی برسات تھی ویسے نہیں تھی

کسی بھی چیز کو چھونے کی اجازت نہ ملی
نظر آتا تھا کہ بہتات تھی ویسے نہیں تھی

مجھ کو مطلوب و میسر کہ دروں رہنا تھا
اک سخاوت پس خیرات تھی ویسے نہیں تھی

عمر ہم لوگ کہاں کاٹتے ہیں
درد کا کوہ گراں کاٹتے ہیں

تم بسر روشنی کرتے جاؤ
ہم چراغوں کا دھواں کاٹتے ہیں

عشق وہ بانجھ زمیں ہے جس پر
سود بوتے ہیں زیاں کاٹتے ہیں

خود ہی پڑھتے ہیں قصیدے اس کے
خود ہی دانتوں سے زباں کاٹتے ہیں

کوئی سازش ہے درون پردہ
تیر اپنی ہی کماں کاٹتے ہیں

زور دریا کی تسلی کے لیے
موجۂ آب رواں کاٹتے ہیں

روز محشر کی سزائیں بھی فراغ
ہم گنہگار یہاں کاٹتے ہیں

بھیڑ میں گم ہو گئے ہم اپنی انگلی چھوڑ کر
منفرد ہونے کی دھن میں اوروں جیسے ہو گئے

کوئی بھی شکل مرے دل میں اتر سکتی ہے
اک رفاقت میں کہاں عمر گزر سکتی ہے

تجھ سے کچھ اور تعلق بھی ضروری ہے مرا
یہ محبت تو کسی وقت بھی مر سکتی ہے

میری خواہش ہے کہ پھولوں سے تجھے فتح کروں
ورنہ یہ کام تو تلوار بھی کر سکتی ہے

ہو اگر موج میں ہم جیسا کوئی اندھا فقیر
ایک سکے سے بھی تقدیر سنور سکتی ہے

صبح دم سرخ اجالا ہے کھلے پانی میں
چاند کی لاش کہیں سے بھی ابھر سکتی ہے

ہر شیشے کا ڈر ہے بھیا
بچوں والا گھر ہے بھیا

عینک کا واویلا کرنا
ٹھوکر سے بہتر ہے بھیا

بس تم اپنے خواب سمیٹو
جس کا بھی بستر ہے بھیا

کھڑکی کے منظر سے اچھی
پردے کی جھالر ہے بھیا

بھابی کے کنگن تھوڑی ہیں
بہنوں کا زیور ہے بھیا

آدھا آدھا رو لیتے ہیں
ایک ٹشو پیپر ہے بھیا

سب کو تھوڑی مرا یقیں آیا
کوئی آیا کوئی نہیں آیا

نئی گنجائش سکوں نکلی
صوفہ دیوار کے قریں آیا

آ گئی نیند مجھ کو سجدے میں
گال تک حلقۂ جبیں آیا

ریت اڑتی ہوئی کہیں پہنچی
پانی رستا ہوا کہیں آیا

پارساؤں کو کیا تمیز بتاں
ہاتھ جس کے جو مہ جبیں آیا

خوش تھے اس کی خوشی میں ہم اظہر
پھر خیالِ دلِ حزیں آیا

نظر کی حد سے نکل کر جمال دیکھنا تھا
جو دیکھنا تھا پس خد و خال دیکھنا تھا

کسی کو چاہنا آسان ہو گیا ہوتا
ہماری سامنے رکھ کر مثال دیکھنا تھا

پڑے ہوئے تھے جہاں ڈھیروں ڈھیر نذرانے
تہی بھی تھا تو مرا کس نے تھال دیکھنا تھا

تمہارے ہجر سے دو چار کون تھا جو نہ تھا
ہمارے دیکھنے والوں کا حال دیکھنا تھا

معاملے جہاں اپنی بقا کے تھے درپیش
کسی نے خاک حلال و حرام دیکھنا تھا

فردیات

اتنی اجرت پہ مت بضد رہیے
اور بھی لوگ کام جانتے ہیں

❀

اس کی مٹھی میں گرفتار ہیں ہم ریت کی مثل
رکتے رکتے بھی روانی سے نکل آئیں گے

❀

مجھ کو پانی کے رویے سے ہوا اندازہ
میں نے دیکھے نہیں ڈوبے ہوئے تیراک کے زخم

عرضِ ناشر

وراق پبلی کیشنز، ادبی تنظیم مجلس وراق کا اشاعتی ادارہ ہے جو غیر کاروباری بنیادوں پر بغیر نفع ونقصان کے کام کر رہا ہے، وراق کا مقصد علم وادب کی ترویج اور معاشرے میں کتاب دوستی کا فروغ ہے، اگر آپ غور فرمائیں تو کتابوں کی قیمتوں اور معیار نے قاری کو کتاب سے دور کر دیا ہے، ایسے عالم میں مجلس وراق نے فیصلہ کیا کہ ایک اشاعتی ادارہ بنایا جائے جس کی ایک کمیٹی ہو جو شائع ہونے کے لائق کتابوں کا معیار قائم کرے اور سستی کتابیں شائع کرے، اس سلسلے میں ہم لکھاری سے خود رابطہ کرتے ہیں اور اس کی تخلیقات بغیر کسی معاوضے کے شائع کرتے ہیں۔ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ کتاب کا مہنگا ہونا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ کتاب اتنی سستی کر دی جائے کہ ایک طالب علم بھی خرید سکے، اس مسئلے کے حل کے لیے ہمیں ڈسٹری بیوٹرز اور بک سیلرز کے منافع میں سے شرح منافع کم کرنا پڑی، اس عمل کے بعد ظاہر ہے ہم مارکیٹ کے مقابلے پر پورا نہیں اتر سکتے تھے لہٰذا فی الحال ہم نے مارکیٹ کو اس کی پالیسی کے مطابق چلنے دیا ہے اور ایک ریڈر کلب تشکیل دیا ہے تا کہ ہمارے ممبرز کم سے کم قیمت پر کتاب حاصل کر سکیں اور یوں ہم اپنے ممبرز کو 100 روپے میں فی کتاب دینے میں کامیاب ہو گئے، آج اللہ سائیں کا شکر ہے کہ ہمارے کلب کے ممبرز کی تعداد 300 کے قریب ہے۔

معزز قاری! کتاب دوستی کے جس مشن کو لے کر ہم چلے ہیں اس میں ہمیں آپ کا ساتھ چاہئے ہمارا ٹارگٹ 2000 ممبرز کا ہے جس کے بعد ہم لکھاری کو بھی رائلٹی دینے کے قابل ہو جائیں گے جو کہ علمی خدمت ہوگی، آپ سے گزارش ہے کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی کتاب دوستی کے اس مشن میں شامل فرمائیں اور ان تک معیاری ادب پہنچانے کا باعث بنیں ان شاءاللہ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے وراق سے چھپنے والی ہر کتاب تاریخی حیثیت کی حامل ہوگی۔

راول حسین

25، سیکنڈ فلور، تاج آرکیڈ، بالمقابل سروسز ہسپتال لاہور۔